BNUR201DET

پریم چند

(Premchand)

بی۔اے۔(آنرس)

چار سالہ پروگرام

دوسرا سمسٹر (اردو)

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

Copyright © 2025, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-994080-8-1
Course : Prem Chand
First Edition : September 2025
Copies : 4100
Price : 85/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Dr. Irshad Ahmad, Assistant Professor (Urdu), CDOE, MANUU, Hyderabad

Editorial Board/Editors

Prof. Nikhath Jahan, Professor Urdu
CDOE, MANUU

Prof. Md Naseemuddin Farees, Urdu Consultant
CDOE, MANUU

Dr. Irshad Ahmad, Assistant Professor
CDOE, MANUU

Dr. Md Nehal, Asst. Prof. (C) / Guest Faculty,
CDOE, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Prof. (C) / Guest Faculty, CDOE, MANUU

Dr. Mohd Jafar, Asst. Prof. (C) / Guest Faculty,
CDOE, MANUU

Production

Prof. Nikhath Jahan
Professor (Urdu)
CDOE MANUU

Mr. P. Habibulla
Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan
Assistant Professor (C)/Guest Faculty,
CDOE MANUU

Mohd Abdul Naseer
Section Officer, CDOE MANUU

Shaik Ismail
UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:
Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in, *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by Dr. Mohd Akmal Khan, Faculty of Urdu, CDOE, MANUU

Printed at : Karshak Print Solutions Limited, Hyderabad

فہرست

پیغام	وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
پیغام	ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	7

اکائی نمبر	اکائی کا نام	مصنف	صفحہ نمبر
بلاک I :	**عہد، حالات زندگی اور ادبی خدمات**		
1-	پریم چند کا عہد اور سیاسی و سماجی حالات	ڈاکٹر بدیع الدین (رحیل صدیقی)	9
2-	پریم چند کے حالات زندگی	ڈاکٹر محمد شارب	24
3-	پریم چند کے ادبی معاصرین	ڈاکٹر محمد جعفر	38
4-	پریم چند کی ادبی خدمات (ناول، خطبات، مضامین، خطوط وغیرہ)	ڈاکٹر محمد اکمل خان	54
بلاک II :	**پریم چند کی ناول نگاری ('توبتہ النصوح' کے حوالے سے)**		
5-	پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات	ڈاکٹر محمد افضل خان	67
6-	افسانہ "عید گاہ" کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد نہال افروز	81
7-	پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات	ڈاکٹر محمد نہال افروز	96
8-	ناول "نرملا" کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد نہال افروز	113
	نمونہ امتحانی پرچہ		127

مصنفین کی تفصیلات

(Writer's Details)

ڈاکٹر بدیع الدین (رحیل صدیقی)، ریجنل ڈائرکٹر،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Badiuddin, Regional Director,
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

ڈاکٹر محمد شارب، پی جی ڈپارٹمنٹ آف لینگویج اینڈ لٹریچر،
فقیر موہن یونیورسٹی، بالیشور، اُڑیسہ

Dr. Mohammad Sharib, PG Department of Language &
Literature, Fakir Mohan Univeristy, Balasore, Oddisha

ڈاکٹر محمد جعفر، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مانو، حیدر آباد

Dr. Mohd Jafar, CDOE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مانو، حیدر آباد

Dr. Mohd Akmal Khan, CDOE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر محمد افضل خان، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)،
سی ڈی او، ای، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Dr. Mohammad Afzal Khan, Assistant Professor
(Contractual), CDOE, AMU, Aligarh

ڈاکٹر محمد نہال افروز، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مانو، حیدر آباد

Dr. Md. Nehal Afroz, CDOE, MANUU, Hyderabad

پروف ریڈرس (Proofreaders):

1. ڈاکٹر محمد نہال افروز
2. ڈاکٹر محمد اکمل خان
3. ڈاکٹر محمد جعفر

ٹائٹل پیج (Title Page): ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ +A حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری / گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات و اطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہو گا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم و تدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلا معاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو / ہندی / انگریزی / عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی او ای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی او ای، مانو

کورس کا تعارف

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم (نظامت فاصلاتی تعلیم)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے طلبا کی تعلیمی ضرورت کے پیش نظر جدید شعری اصناف کے موضوع پر درسی مواد تیار کیا ہے۔ یہ مواد چار سالہ بی۔ اے۔ پروگرام کے پہلے سمسٹر کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبا کے لیے دوران تعلیم ایک نظام تعلیم سے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یو جی سی کی اسی ہدایت کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا ہے۔ یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی۔ موجودہ تعلیمی ضرورت کے پیش نظر این ای پی 2020 (NEP-2020) کے تحت اردو طلبا کے لیے خود اکتسابی مواد تیار کیا جارہا ہے۔ یہ مواد چار سالہ (آٹھ سمسٹر) کورس کے لیے تیار کیا جارہا ہے جس کی تیاری میں ملک بھر کے مختلف جامعات اور تعلیمی اداروں کے ماہر اساتذہ اپنا تعاون کر رہے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے نہ صرف اردو طلبا کی ضرورت کی تکمیل ہو گی بلکہ اردو داں طبقے کے لیے بھی یہ مواد قدر مفید ثابت ہو گا۔

نئے نصاب کی تیاری میں مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم کی موجودہ کتب میں دستیاب مطلوبہ مواد کو ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اور نئے نصاب کے تقاضوں کے پیش نظر نئی اکائیاں بھی لکھوائی گئی ہیں جو کورس کے خود اکتسابی مواد کا حصہ بنی ہیں۔

اس کتاب میں مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی ہے جو یکساں نصاب کے تحت روایتی اور فاصلاتی تعلیم دونوں کی ضرورتوں کو بیک وقت پورا کر سکے۔ ہر اکائی کے تحت موضوع سے متعلق مواد کے علاوہ' اکتسابی نتائج، کلیدی الفاظ، نمونۂ امتحانی سوالات اور تجویز کردہ اکتسابی مواد کی فہرست بھی دی گئی ہیں۔ امید ہے یہ معلومات طلبا کے لیے بے حد معاون ہوں گی۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم چار سالہ بی۔ اے۔ کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ پہلے سمسٹر کے اس پرچے کا عنوان "پریم چند" ہے۔ یہ ایک انتخابی پرچہ ہے اور اس پرچے میں کل آٹھ اکائیاں ہیں۔ یہ پرچہ پریم چند کے خصوصی مطالعے کے تمام اکتسابی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، جس میں پریم چند کے حالات زندگی، ان کے ادبی معاصرین، افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی خصوصیات کے ساتھ ان کی تخلیقات کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور متن کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ نصابی کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی بیش قیمت آرا ہمیں اس کتاب کو مزید بہتر، کارآمد اور مفید بنانے میں مدد گار ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر ارشاد احمد

کورس کوآرڈی نیٹر

پریم چند

اکائی 1: پریم چند کا عہد اور سیاسی و سماجی حالات

اکائی کے اجزا

1.0		تمہید
1.1		مقاصد
1.2		پریم چند کا عہد اور سیاسی و سماجی حالات
	1.2.1	پریم چند کا عہد
	1.2.2	پریم چند کے عہد کے سیاسی حالات
	1.2.3	پریم چند کے عہد کے سماجی حالات
	1.3.4	پریم چند کے عہد میں اردو افسانے کی صورت حال
1.3		اکتسابی نتائج
1.4		کلیدی الفاظ
1.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	1.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	1.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	1.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
1.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

پریم چند اردو اور ہندی ادب کے عظیم افسانہ نگار اور ناول نگار تھے جنہوں نے اپنی تحریروں سے ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کی۔ ان کا عہد (1880–1936) برطانوی راج اور ہندوستانی معاشرے کے اہم سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا دور تھا۔ پریم چند نے اپنے ادب کے ذریعے عام آدمی کی زندگی، غربت، استحصال اور سماجی ناانصافیوں کو بے نقاب کیا۔

پریم چند کا عہد ہندوستانی ادب کا سنہرا دور تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے نہ صرف ادب کو نیا رنگ دیا بلکہ سماجی تبدیلی کی راہ بھی ہموار کی۔ آج بھی ان کی تخلیقات کو ہندوستانی سماج کی عکاسی کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ پریم چند کا ادب صرف

ایک دور کی داستان نہیں، بلکہ آج بھی ہمارے معاشرے کے لیے مشعل راہ ہے۔ان کی تحریوں سے یہ عیاں ہے کہ وہ ایک عہد کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ سارے ترجمات جو بیسویں صدی کے اوائل میں وقوع پذیر ہوئے وہ کسی نہ کسی شکل میں پریم چند کی تحریروں میں نمایاں ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کی تخلیقات ایک عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔پریم چند نے اپنے فکشن میں اپنے عہد کی معاشرتی زندگی، سیاسی و سماجی، قومی و ملکی حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔پریم چند کے افسانے، ناول اور مضامین کے مطالعے سے ہم ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تبدیلوں کا بخوبی اندازہ لگاسکتے ہیں۔اس اکائی میں ہم پر ہم چند کے عہد کی سیاسی اور سماجی حالات نیز افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا مطالعہ کریں گے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- پریم چند کے عہد سے واقف ہو سکیں۔
- پریم چند پریم چند کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات پر تبصرہ سکیں۔
- پریم چند کے عہد میں فکشن نگاری کی صورت حال کو سمجھ سکیں۔
- پریم چند کے عہد کے ناول اور افسانہ کی اہم خصوصیات بیان کر سکیں۔
- پریم چند کے عہد میں فکشن کی زبان سے واقف ہو سکیں۔

1.2 پریم چند کا عہد اور سیاسی و سماجی حالات

1.2.1 پریم چند کا عہد:

پریم چند کا عہد اردو اور ہندی ادب کی تاریخ میں ایک انقلابی دور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔یہ بیسویں صدی کی ابتدا سے 1936ء تک کا زمانہ ہے۔یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کئی سطحوں پر گہری تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔سیاسی بیداری، سماجی انقلابات اور ادبی رجحانات کی تبدیلیاں اس عہد کی نمایاں خصوصیات تھیں۔پریم چند کا ادبی سفر انہی تغیرات کے درمیان پروان چڑھا اور انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے اس پورے عہد کو نہ صرف عکس بند کیا بلکہ اس کی تشکیل میں بھی کردار ادا کیا۔پریم چند کا زمانہ ہندوستان میں برطانوی استعماریت، قومی تحریک آزادی اور سماجی اصلاحات کا دور تھا۔اس عہد میں ہندوستانی معاشرہ زمینداری نظام، جاگیرداری اور طبقاتی تفریق کا شکار تھا۔دیہاتی علاقوں میں کسانوں کا استحصال ہوتا تھا، جب کہ شہروں میں نوآبادیاتی نظام کے تحت نئی معیشت پروان چڑھ رہی تھی۔پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں انہی مسائل کو موضوع بنایا۔

پریم چند کا ماننا تھا کہ ادب کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ معاشرتی بیداری اور اصلاح ہے۔وہ "ادب برائے زندگی" کے نظریے کے حامی تھے۔انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے سیاسی حالات، سماجی برائیوں، جہیز کی لعنت، ذات

پات کی تفریق عورتوں کے استحصال اور تعلیم کی اہمیت وغیرہ کے خلاف آواز اٹھائی۔

پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں عام انسان کی زندگی کے مسائل کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں دیہی زندگی کی تصویریں، کسانوں کی غربت، مزدوروں کی مشکلات اور معاشرتی ناانصافیوں کا گہرا نقش ملتا ہے۔ انہوں نے مظلوم طبقے کی حمایت میں قلم اٹھایا اور ان کی حالتِ زار کو ادب کے ذریعے عوام کے سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی۔

پریم چند کے افسانے اور ناول محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک سوچ، ایک پیغام اور ایک تحریک ہیں۔ وہ انسانی ہمدردی، مساوات اور عدل کے قائل تھے۔ ان کی تحریروں میں اخلاقی اقدار کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ''گئودان''، ''نرملا''، ''نمک کا داروغہ''، ''کفن'' اور ''پوس کی رات'' جیسے شاہکار افسانے اور ناول آج بھی ہمارے معاشرے کی سچائیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ پریم چند نے ادب کے ذریعے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا اور اس سے سماج میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ ان کا ماننا تھا کہ جب تک ادب عوام کے دکھ درد کو نہ چھُوئے، وہ بے روح ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی تحریریں صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ ایک جذبہ، ایک جدوجہد اور ایک مقصد کا اظہار ہیں۔ ان کے نظریے ''ادب برائے زندگی'' نے اردو اور ہندی ادب کو ایک نیا رخ دیا، جس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

1.2.2 پریم چند کے عہد کے سیاسی حالات:

پریم چند کا ادبی سفر ایک ایسے دور میں شروع ہوا جب برصغیر سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے ایک عظیم انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا۔ پریم چند کے عہد کے سیاسی حالات نہایت ہنگامہ خیز، نازک اور بیداری سے بھرپور تھے۔ برطانوی سامراج کی ظالمانہ حکمرانی، عوامی تحریکوں کی بیداری اور آزادی کے لیے جاری جدوجہد نے نہ صرف ملک کے سیاسی منظرنامے کو بدلا بلکہ ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے، جن کی جھلک پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔

پریم چند نے جس عہد میں آنکھ کھولی، وہ ہندوستان میں برطانوی تسلط کا زمانہ تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے وسائل پر قبضہ جما رکھا تھا۔ زراعت، تجارت، تعلیم اور سیاست کے تمام شعبے ان کے قابو میں تھے۔ ہندوستانی عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ، کسانوں کا استحصال، زمیندارانہ نظام کی ظالمانہ گرفت اور نوآبادیاتی قوانین نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے عوام میں بغاوت اور بیداری کے جذبات کو ابھارا۔ پریم چند کے عہد میں کئی اہم سیاسی تحریکیں اور واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ہندوستان کی سیاست کا رخ موڑ دیا۔ ذیل میں اہم تحریکوں اور واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

1905 کی تقسیمِ بنگال اور سودیشی تحریک:

برطانوی حکومت نے 1905ء میں بنگال کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا، جس کا مقصد اپنی نوآبادیاتی حکمتِ عملی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' (Divide and Rule) کو فروغ دینا تھا۔ اس فیصلے کے تحت بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا: مشرقی بنگال اور آسام کو ایک اکثریتی مسلم علاقہ قرار دیا گیا، جب کہ مغربی بنگال میں ہندو اکثریت تھی۔ اگرچہ اس فیصلے کو انتظامی سہولت کا جواز دیا گیا، لیکن درحقیقت اس کا مقصد ہندو اور مسلم آبادی کے درمیان نفاق ڈالنا اور بھارتی عوام کے اندر بڑھتے ہوئے اتحاد کو کمزور کرنا تھا۔

اس تقسیم کے خلاف پورے ہندوستان میں شدید ردِ عمل سامنے آیا، خاص طور پر بنگال میں۔ عوام، طلبہ، دانشور، سیاستدان اور مختلف مذہبی و سماجی تنظیمیں اس فیصلے کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس تحریک نے جلد ہی ایک منظم شکل اختیار کر لی اور "سودیشی تحریک" (Swadeshi Movement) کے نام سے مشہور ہوئی۔

سودیشی تحریک کی اہم خصوصیات:

i. غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ: عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ برطانوی ساختہ مصنوعات کا استعمال بند کر دیں۔ خاص طور پر کپڑا، چینی اور دیگر درآمد شدہ اشیا کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔

ii. مقامی مصنوعات کو فروغ: سودیشی تحریک کا بنیادی مقصد مقامی صنعتوں اور مصنوعات کو فروغ دینا تھا تاکہ نہ صرف برطانوی اقتصادی مفادات کو نقصان پہنچایا جاسکے بلکہ خود انحصاری کو بھی فروغ دیا جائے۔

iii. قومی شعور کی بیداری: اس تحریک نے ہندوستانیوں کے اندر قومی شعور کو بیدار کیا۔ عوام کو یہ احساس ہوا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف متحد ہو کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔

iv. ثقافتی اور تعلیمی اداروں کا قیام: سودیشی تحریک کے دوران بہت سے قومی تعلیمی ادارے، ہنر سکھانے والے مراکز، اور ثقافتی تنظیمیں قائم کی گئیں تاکہ انگریزی نظامِ تعلیم پر انحصار کم کیا جاسکے۔

v. ادب اور صحافت کا کردار: اخبارات، رسائل، شاعری اور تقریریں اس تحریک کا اہم ذریعہ بنیں۔ قومی زبانوں میں لکھی گئی تحریروں نے عوام کو جوش و خروش سے بھر دیا۔

یہ تحریک صرف ایک تجارتی بائیکاٹ نہیں تھی بلکہ ایک مکمل سیاسی اور سماجی انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ اس نے ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کو ایک نئی سمت دی اور آنے والی تحریکوں کے لیے بنیاد فراہم کی۔ بالآخر، عوامی دباؤ کے نتیجے میں 1911ء میں برطانوی حکومت کو بنگال کی تقسیم کو واپس لینا پڑا، جو سودیشی تحریک کی ایک بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے۔

1919 کا رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ:

رولٹ ایکٹ، جسے "بلیک لا" بھی کہا جاتا ہے، 1919ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں نافذ کیا۔ اس ایکٹ کے تحت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھی شخص کو بغیر کسی مقدمے کے، بغیر صفائی کا موقع دیے اور بغیر کسی وجہ بتائے قید میں رکھ سکتی تھی۔ اس قانون کا مقصد پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں بڑھتی ہوئی سیاسی بیداری اور آزادی کی تحریک کو دبانا تھا۔ تاہم، یہ ایکٹ ہندوستانی عوام کے بنیادی حقوق کی کھلی خلاف ورزی تھی، جس نے لوگوں میں شدید غصے اور بے چینی کو جنم دیا۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف ردِ عمل:

رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ملک میں زبردست احتجاج شروع ہو گیا۔ مہاتما گاندھی نے اس کے خلاف "روایت شکن تحریک"

(Satyagraha) کا اعلان کیا، جس کا مقصد پُر امن طور پر قانون کی مزاحمت کرنا تھا۔ جگہ جگہ جلسے، جلوس اور ہڑتالیں ہونے لگیں۔ عوام کی بڑی تعداد سڑکوں پر نکل آئی اور برطانوی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے لگی۔

جلیانوالہ باغ کا سانحہ:

13 اپریل 1919ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں لوگ جمع ہوئے تھے۔ ان میں مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے، جو رولٹ ایکٹ کے خلاف پُر امن احتجاج کر رہے تھے۔ یہ دن بیساکھی کا تہوار بھی تھا، جس کے باعث باغ میں موجود لوگوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔

اسی دوران برطانوی فوج کا ایک افسر، جنرل ڈائر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اس نے بغیر کسی وارننگ کے باغ کے واحد داخلی راستے کو بند کروا کر فائرنگ کا حکم دے دیا۔ فوجیوں نے تقریباً 10 منٹ تک مسلسل گولیاں برسائیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 379 افراد شہید ہوئے، جب کہ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق ہزار سے زائد لوگ مارے گئے اور ہزاروں افراد زخمی بھی ہوئے۔

جلیانوالہ باغ کا یہ دلخراش واقعہ پورے ہندوستان میں غم و غصے کی لہر لے آیا۔ یہ ظلم و بربریت کی ایسی مثال تھی جس نے لاکھوں ہندوستانیوں کو برطانوی حکومت کے خلاف کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعے نے ہندوستانی قوم پرستی کو ایک نئی جِلا بخشی اور لوگوں میں آزادی کی جدوجہد کا جذبہ مزید مضبوط ہوا۔ گاندھی جی سمیت کئی قومی رہنماؤں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی تحریک کو تیز کر دیا۔ اسی واقعے کے بعد "عدم تعاون تحریک" (Non-Cooperation Movement) کی بنیاد رکھی گئی۔

رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ ہندوستان کی تاریخ کے سیاہ ترین ابواب میں سے ایک ہیں۔ ان واقعات نے نہ صرف عوام کو آزادی کے لیے متحد کیا بلکہ یہ واضح کر دیا کہ برطانوی حکومت کے ظلم و ستم کا خاتمہ صرف آزادی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

1920 -1920 کی عدم تعاون تحریک:

مہاتما گاندھی نے جب عدم تعاون تحریک کا آغاز کیا تو اس کا مقصد برطانوی حکومت کے تسلط کو چیلنج کرنا اور ہندوستانیوں کو یہ شعور دینا تھا کہ وہ خود اپنے حالات بدل سکتے ہیں۔ اس تحریک کے تحت گاندھی جی نے عوام سے اپیل کی کہ وہ برطانوی اداروں، تعلیمی نظام، عدالتوں اور دیگر سرکاری سہولیات کا مکمل بائیکاٹ کریں۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر ہندوستانی عوام ان اداروں کا استعمال بند کر دیں تو برطانوی حکومت کا اقتدار خود بخود کمزور ہو جائے گا۔ اس تحریک نے پورے ملک میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے اس میں حصہ لیا۔ ادیب، شاعر، استاد، وکیل اور طلبہ سب نے اپنی اپنی حیثیت میں برطانوی نظام سے علیحدگی اختیار کی۔

پریم چند، جو اُس وقت ایک سرکاری ملازم تھے، اس تحریک سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ادیب کا اصل فریضہ صرف ادب تخلیق کرنا ہی نہیں بلکہ قوم کی خدمت بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے برطانوی حکومت کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور اپنی زندگی کو مکمل طور پر ادب اور قومی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے عوام میں بیداری پیدا کی، ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی، اور ہندوستانی سماج کے حقیقی مسائل کو اجاگر کیا۔

پریم چند کا یہ قدم نہ صرف ان کی ذاتی قربانی کا مظہر تھا بلکہ اس نے ہندوستانی ادبیات میں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی، جس میں ادب کو قومی تحریک کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا گیا۔ ان کی تحریریں آج بھی اسی جذبے کی عکاسی کرتی ہیں جس سے انہوں نے عدم تعاون تحریک کے دور میں اپنی وابستگی ظاہر کی تھی۔

1930 کی سول نافرمانی تحریک (نمک ستیہ گرہ):

یہ تحریر تحریکِ آزادی ہند کے ایک نہایت اہم باب یعنی ''نمک ستیہ گرہ'' یا ''ڈانڈی مارچ'' پر روشنی ڈالتی ہے، جو مہاتما گاندھی کی قیادت میں انجام پایا۔ برصغیر کی تحریک آزادی میں کئی تاریخی لمحات آئے، لیکن 1930ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں شروع ہونے والی ''نمک ستیہ گرہ'' تحریک ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ یہ تحریک انگریزوں کے ظالمانہ نمک قوانین کے خلاف ایک پرامن احتجاج تھا، جو کہ انگریز سرکار نے ہندوستانیوں پر نافذ کیے تھے۔ ان قوانین کے تحت عام ہندوستانیوں کو سمندر کے کنارے سے نمک اکٹھا کرنے کی اجازت نہیں تھی اور انہیں وہی نمک مہنگے داموں خریدنے پر مجبور کیا جاتا تھا جو ان کے اپنے ملک میں پیدا ہوتا تھا۔

12 مارچ 1930ء کو مہاتما گاندھی نے گجرات کے شہر ''سابرمتی آشرم'' سے اپنے 78 ساتھیوں کے ہمراہ ایک تاریخی مارچ کا آغاز کیا۔ ان کا مقصد تھا کہ وہ 240 میل (تقریباً 385 کلومیٹر) کا فاصلہ طے کر کے ڈانڈی کے ساحل تک پہنچیں اور وہاں جا کر خود نمک تیار کریں، جو انگریزوں کے قوانین کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ یہ مارچ پورے ملک کے لیے ایک علامتی احتجاج بن گیا۔ راستے میں گاؤں گاؤں لوگ گاندھی جی کے قافلے میں شامل ہوتے گئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ قافلہ ایک عظیم عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ مارچ 6 اپریل 1930ء کو ڈانڈی پہنچا، جہاں گاندھی جی نے ساحل پر پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے نمک تیار کیا، اور یوں انگریز قانون کی خلاف ورزی کی۔

ڈانڈی مارچ ایک تاریخی قدم تھا جس نے ہندوستانیوں کو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی ترغیب دی۔ اگرچہ فوری طور پر یہ تحریک مکمل کامیابی حاصل نہ کر سکی، لیکن اس نے آزادی کی لڑائی میں ایک ایسا جوش پیدا کر دیا جسے دبانا ممکن نہ تھا۔

پریم چند ایک حساس اور حقیقت پسند ادیب تھے۔ ان کی تخلیقات میں سیاسی شعور اور عوامی مسائل کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے آزادی کی جدوجہد، سماجی ناانصافی، طبقاتی کشمکش، دیہی زندگی کی بدحالی اور کسانوں کے مسائل کو نہایت جرات مندی سے اجاگر کیا۔

پریم چند کے عہد کے سیاسی حالات ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا سنگ میل ثابت ہوئے۔ ان حالات نے عوام میں بیداری پیدا کی، سماج کو جھنجھوڑا اور ادیبوں کو نئی فکری جہت عطا کی۔ پریم چند نے نہ صرف ان حالات کا گہرا مشاہدہ کیا بلکہ انہیں اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ ان کا ادب صرف فن کا اظہار نہیں بلکہ ایک دور کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ بھی ہے۔

1.2.3 پریم چند کے عہد کے سماجی حالات:

پریم چند کا عہد سیاسی اتھل پتھل کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کا دور تھا۔ ان کے افسانے اور

ناول اسی عہد کے آئینہ دار ہیں۔اس دور کے سماجی حالات کو سمجھنا پریم چند کے ادب کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ذیل میں اس عہد کے کچھ اہم سماجی حالات بیان کیے جا رہے ہیں:

سماجی ناانصافیاں اور ذات پات کا نظام:

پریم چند کے ادبی کارناموں کا سب سے اہم پہلو اُن کی سماجی بصیرت اور حقیقت نگاری ہے۔ اُنہوں نے جس دور میں قلم اٹھایا، وہ ہندوستانی سماج میں گہرے تضادات اور ناانصافیوں کا دور تھا، جہاں ذات پات کی بنیاد پر انسانوں کو درجہ بندی میں تقسیم کیا گیا تھا۔ نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو نہ صرف سماجی طور پر کمتر سمجھا جاتا تھا بلکہ اُنہیں روزمرہ زندگی کے بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا تھا۔ یہ لوگ اعلیٰ ذات کے افراد کے ظلم، تحقیر اور استحصال کا شکار تھے، اور اُن کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔

پریم چند نے ان مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے افسانوں کے ذریعے ان غیر منصفانہ رویوں کو معاشرے کے سامنے بے نقاب کیا۔ اُن کے مشہور افسانہ ''ٹھاکر کا کنواں'' اس موضوع کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ اس افسانے میں ایک نچلی ذات کا شخص، جو سخت پیاس کی حالت میں ہوتا ہے، پانی کی تلاش میں نکلتا ہے، لیکن اُس پر سماج کی سخت پابندیاں عائد ہیں۔ اُسے گاؤں کے کنویں سے پانی لینے کی اجازت نہیں کیونکہ وہ کنواں ٹھاکر کی ملکیت ہے اور ذات پات کی رکاوٹیں اسے اُس پانی کو چھونے سے بھی روکتی ہیں۔

افسانے میں یہ منظر انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے کہ پیاس کی شدت کے باوجود وہ شخص کنویں کے قریب جا کر بھی پانی نہیں پی سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو اُسے سخت سزا دی جائے گی۔ آخر کار وہ مجبور ہو کر گندے اور بدبودار جوہڑ سے پانی پیتا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اُس کی ذات کو اتنا کمتر سمجھا جاتا ہے کہ اُسے صاف پانی تک میسر نہیں۔

پریم چند نے اس افسانے میں نہ صرف ذات پات کے ظالمانہ نظام کی مذمت کی بلکہ انسانی وقار، برابری اور انصاف کے لیے ایک پُراثر پیغام بھی دیا۔ اُن کی تحریر صرف افسانہ نگاری نہیں بلکہ ایک سماجی جدوجہد ہے، جس میں وہ مظلوموں کی آواز بنتے ہیں اور اُن کے حق میں بولتے ہیں۔ ''ٹھاکر کا کنواں'' صرف ایک کہانی نہیں بلکہ ایک علامت ہے اُس معاشرتی نظام کی، جس میں انسانوں کو اُن کی پیدائش کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔

زرعی نظام اور کسانوں کی حالت:

برطانوی دورِ حکومت میں ہندوستان کا زرعی نظام بہت ہی غیر منصفانہ اور ظالمانہ تھا۔ کسانوں کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ وہ زیادہ تر چھوٹے کسان تھے جن کے پاس اپنی زمین نہیں تھی، یا اگر زمین تھی بھی تو بہت تھوڑی۔ بڑے زمین دار اور جاگیر دار کسانوں کی محنت کا استحصال کرتے تھے۔ کسان اپنی فصل اگانے کے لیے زمین داروں سے زمین لیتے، اور بدلے میں ان کو بھاری حصہ دینا پڑتا۔

مزید برآں، کسان ساہوکاروں یعنی مقامی سود خوروں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے کیونکہ فصل اگانے کے لیے بیج، کھاد، اوزار اور دیگر ضروریات کا بندوبست وہ اپنی محدود آمدنی سے نہیں کر سکتے تھے۔ ساہوکار ان کو بہت زیادہ شرحِ سود پر قرض دیتے اور اکثر یہ قرض کئی نسلوں تک چلتا رہتا۔ کسان ساری عمر قرض کے جال میں پھنسے رہتے اور غربت سے باہر نہیں نکل پاتے تھے۔

پریم چند نے اس صورتِ حال کو بہت شدت سے محسوس کیا اور اپنے افسانوں اور ناولوں میں کسانوں کے مسائل کو نمایاں انداز میں پیش کیا۔ ان کا مشہور ناول ''گئودان'' کسانوں کی زبوں حالی کا ایک جیتا جاگتا خاکہ ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ''ہوری'' ایک غریب کسان ہے جو اپنی زندگی بھر کی کمائی سے صرف ایک گائے خریدنا چاہتا ہے تاکہ وہ دودھ حاصل کر کے اپنے بچوں کو پال سکے۔ لیکن وہ ظالم سماجی نظام، ساہوکاروں، پنڈتوں اور زمین داروں کے ظلم کا شکار ہو جاتا ہے۔

''گئودان'' میں پریم چند نے نہ صرف معاشی استحصال کو دکھایا بلکہ سماجی ناانصافی، مذہبی دھوکہ دہی، طبقاتی فرق اور دیہی معاشرے کی بے حسی کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ہوری کی جدوجہد ایک عام کسان کی نمائندگی کرتی ہے جو اپنی محنت سے زندگی بہتر بنانا چاہتا ہے، لیکن ہر طرف سے استحصال کا شکار ہوتا ہے۔

یہ ناول صرف ایک کہانی نہیں بلکہ اس دور کے زرعی نظام کا حقیقی عکس ہے۔ پریم چند نے کسان کی زندگی کی تلخیوں، اس کے خوابوں، اس کی محنت اور اس کے دکھ کو اتنی سچائی سے لکھا کہ ''گئودان'' آج بھی کسانوں کی حالت پر ایک اہم ادبی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔

سماجی استحصال اور غربت:

معاشی استحصال اور غربت وہ مسائل ہیں جنہوں نے ہمیشہ سے ترقی پذیر معاشروں کو جکڑے رکھا ہے، خاص طور پر دیہی علاقوں میں یہ صورتحال مزید سنگین صورت اختیار کر لیتی ہے۔ زمینداری نظام، جاگیرداری اور غیر منصفانہ معاشی ڈھانچے نے غریب عوام کو ایک ایسے چکر میں پھنسا رکھا تھا جس سے نکلنا تقریباً ناممکن تھا۔ محنت کش طبقہ، خاص طور پر کسان اور مزدور، دن رات محنت کرنے کے باوجود اپنی بنیادی ضروریات پوری نہیں کر پاتے تھے۔

دیہی علاقوں میں تعلیمی اداروں کی کمی، ناقص تعلیمی نظام اور تعلیم تک محدود رسائی نے عوام کو شعور سے محروم رکھا۔ جب تک لوگ اپنے حقوق سے آگاہ نہ ہوں، استحصال کا خاتمہ ممکن نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کم تعلیم یافتہ عوام آسانی سے لالچ یا دباؤ کا شکار ہو کر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتے۔

روزگار کے مواقع بھی نہایت محدود تھے۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی یا دیہاڑی مزدوری پر انحصار کرتے تھے، جہاں اجرت کم اور کام کا بوجھ زیادہ ہوتا۔ صنعتیں یا فیکٹریاں زیادہ تر شہروں میں قائم تھیں، اور دیہی عوام کے لیے ان تک رسائی مشکل تھی۔ نتیجتاً، بیروزگاری اور کم آمدنی نے غربت کو مزید گہرا کر دیا۔

صحت کی سہولیات کا فقدان بھی غربت میں اضافے کا باعث بنا۔ دیہی علاقوں میں نہ تو مناسب ہسپتال موجود تھے اور نہ ہی تربیت یافتہ طبی عملہ۔ بیماری کی صورت میں لوگ دیسی ٹوٹکوں یا غیر مستند طریقہ علاج پر انحصار کرتے، جس سے اکثر ان کی حالت مزید بگڑ جاتی۔ علاج پر آنے والا خرچ بھی ایک بڑی مالی پریشانی بن جاتا، جو پہلے سے ہی مالی مشکلات کا شکار خاندانوں کو مزید پیچھے دھکیل دیتا۔

غربت اور استحصال کے اس چکر نے معاشرتی ڈھانچے میں گہرے نقوش چھوڑے۔ امیر اور غریب کے درمیان فرق مسلسل بڑھتا گیا اور غریب طبقے کے لیے بہتر زندگی کی امید ایک خواب بن کر رہ گئی۔ جب تک معاشی انصاف، معیاری تعلیم، روزگار کے بہتر مواقع اور

بنیادی صحت کی سہولیات فراہم نہیں کی جاتیں، تب تک غربت اور استحصال کا خاتمہ محض ایک خواب ہی رہے گا۔

خواتین کی حالت:

پریم چند کے عہد میں ہندوستانی سماج میں خواتین کی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ اس دور کا معاشرہ مردانہ غلبے پر مبنی تھا، جہاں عورتوں کو کمتر سمجھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ پریم چند کے عہد میں عورت کی شناخت محض ایک بیوی، بیٹی یا ماں کے طور پر ہوتی تھی، نہ کہ ایک خود مختار اور آزاد انسان کے طور پر ۔ لہٰذا انہوں نے اپنی کہانیوں میں اس کو بھی موضوع بحث بنایا۔

تعلیم کے میدان میں عورتوں کو شدید پسماندگی کا سامنا تھا۔ زیادہ تر گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کو فضول یا غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ان کا کام صرف گھریلو ذمہ داریاں نبھانا اور بچپن سے ہی شادی کی تیاری کرنا سمجھا جاتا تھا۔ اس سوچ نے خواتین کو شعور، ترقی اور آگاہی سے محروم رکھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے حقوق سے بھی ناواقف رہیں۔

عورتوں کو جائیداد اور وراثت میں حصہ دینا تو دور، اکثر انہیں اپنی ذاتی ملکیت رکھنے کا بھی حق حاصل نہ تھا۔ بیٹی کی پیدائش کو بوجھ سمجھا جاتا اور جہیز کا نظام والدین پر اضافی مالی دباؤ ڈال دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی گھرانوں میں بیٹیوں کو بوجھ سمجھ کر ان کی تعلیم اور تربیت پر توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

بیواؤں کی حالت اس دور میں نہایت تکلیف دہ تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد ان کی زندگی گویا ختم سمجھی جاتی تھی۔ انہیں سادہ لباس، مخصوص غذا اور سماجی تقریبات سے کنارہ کشی جیسے سخت اصولوں میں جکڑ دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات انہیں خاندان یا سماج کا منحوس سمجھا جاتا اور ان پر دوبارہ شادی کرنے کی پابندی بھی تھی۔ ان کے جذبات، خواہشات اور ضروریات کو نظر انداز کر کے انہیں بس جیتے جی ایک قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس موضوع پر پریم چند نے کئی تخلیقات پیش کیں جن میں ''نرملا''، ''بیوہ''، '' بازار حسن'' وغیرہ اہم ہیں۔

پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں عورتوں کی اس حالتِ زار کو نہ صرف نمایاں کیا بلکہ ان کے حق میں آواز بھی بلند کی۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں عورت کو محض ایک مظلوم کردار کے بجائے ایک باشعور، باہمت اور باوقار انسان کے طور پر پیش کیا۔ ان کے کرداروں میں عورت نے کبھی ظلم کے خلاف بغاوت کی، کبھی محبت اور وفاداری کی مثال قائم کی اور کبھی ماں بن کر قربانی کی انتہا کر دی۔

اس دور کی عورتوں کی حالت ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ سماجی ترقی کا پہلا قدم عورت کو اس کا جائز مقام دینا ہے۔ جب تک عورت تعلیم، آزادی، جائیداد اور برابری کے حقوق سے محروم رہے گی، معاشرہ کبھی مکمل ترقی نہیں کر سکتا۔

تعلیم کی کمی:

پریم چند کے عہد میں تعلیم ایک نایاب اور محدود سہولت تھی، جو صرف مخصوص طبقوں تک محدود تھی۔ خاص طور پر دیہی علاقوں میں تعلیمی اداروں کی کمی، اساتذہ کی عدم موجودگی اور عوامی شعور کی کمی نے تعلیم کو ایک خواب بنا دیا تھا۔ اکثریت ناخواندہ تھی، اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے کوئی مؤثر حکومتی منصوبہ موجود نہ تھا۔

دیہات میں والدین بچوں کو اسکول بھیجنے کے بجائے کھیتوں یا دیگر کاموں میں لگا دیتے تاکہ گھریلو آمدنی میں کچھ اضافہ ہو سکے۔

لڑکیوں کی تعلیم کو تو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا تھا، کیونکہ انہیں صرف گھریلو ذمہ داریوں تک محدود رکھا جاتا تھا۔ لڑکوں کو بھی اگر تعلیم دی جاتی تو وہ صرف بنیادی حساب کتاب یا مذہبی تعلیم تک محدود ہوتی تھی۔

تعلیم کی کمی نے معاشرے میں ایک گہری خاموشی اور لاعلمی کو جنم دیا، جس کا فائدہ ہمیشہ استحصالی طبقے نے اٹھایا۔ لوگ اپنے بنیادی حقوق سے ناآشنا تھے، نہ وہ قانونی پیچیدگیوں کو سمجھتے تھے، نہ ہی سماجی نابرابری کے خلاف آواز اٹھا سکتے تھے۔ لاعلمی نے انہیں پسماندہ رکھا اور ان کی محرومیوں کو ہمیشہ کے لیے ایک معمول بنا دیا۔

پریم چند نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں بارہا تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو انسان کو شعور، خود اعتمادی اور آزادی فراہم کرتا ہے۔ ان کے کردار اکثر ایسے افراد ہوتے ہیں جو یا تو تعلیم سے محروم ہوتے ہیں اور استحصال کا شکار بنتے ہیں، یا پھر تعلیم حاصل کر کے اپنے اور اپنے معاشرے کی تقدیر بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کی مشہور کہانی "عید گاہ" میں چھوٹا حامد جس طرح عقل اور سمجھداری سے چیز خریدتا ہے، وہ یہ دکھاتا ہے کہ صرف کتابی تعلیم ہی نہیں بلکہ شعور اور سیکھنے کی صلاحیت بھی اہم ہے۔ پریم چند تعلیم کو محض ایک فرد کا مسئلہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ اسے پوری قوم کی ترقی کا زینہ مانتے تھے۔

پریم چند اپنے ناولوں اور افسانوں نے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ جب تک تعلیم کو عام نہیں کیا جائے گا، خصوصاً دیہی علاقوں میں، تب تک غربت، جہالت اور استحصال کا خاتمہ ممکن نہیں۔ تعلیم صرف علم کا نام نہیں، بلکہ یہ انسان کو خود مختاری، آزادئ رائے اور انصاف کے لیے لڑنے کی طاقت دیتی ہے۔

1.2.4 پریم چند کے عہد میں اردو افسانے کی صورت حال:

آپ بخوبی واقف ہیں کہ پریم چند کا عہد بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر 1936 تک تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اردو افسانے کی ابتدا راشد الخیری کے افسانے "نصیر اور خدیجہ" سے ہوتی ہے۔ یہ افسانہ پہلی مرتبہ رسالہ "مخزن" میں 1903 میں شائع ہوا تھا۔ پریم چند سے قبل سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، فیض الحسن، پیارے لال آشوب، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، حکیم یوسف حسن، سجاد ظہیر، علی محمود وغیرہ اردو افسانے کے منظر پر نظر آنے لگے تھے اور ان کے افسانے ہندوستان کے مختلف رسالے میں شائع ہونے لگے تھے۔

انیسویں صدی کے آخری دہائی میں ناول منظر عام پر آنے لگے تھے۔ ناول کی طرح افسانے کے نمونے بھی پریم چند سے قبل ہندوستان کے معروف و مقبول رسائل دلگداز، اودھ پنچ، مخزن، بیسویں صدی وغیرہ میں شائع ہو رہے تھے۔ اسی عہد میں انگریزی اور دیگر زبانوں کے ترجمہ شدہ افسانے بھی شائع ہو رہے تھے۔ ان کے علاوہ عہد پریم چند میں پریم چند قبل کئی ادیب ایسے تھے جنہوں نے مغربی طرز کے افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے اور مغربی فکر و فن سے اردو زبان و ادب سے روشناس کرا رہے تھے۔ ان اہم ادیبوں میں علی محمود، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور راشد الخیری شامل ہیں۔

اس عہد کا ایک اہم سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔ ان کی افسانوی دنیا حقیقت پسند ہوتے ہوئے بھی داستانوی رنگ لیے ہوئے تھی۔ ان

کی افسانے میں داستانوی دنیا کی رومانوی فضا، جذباتیت اور مثالیت پائی جاتی ہے، جو داستان کا اختصاص ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے شعور پر داستانوی فضا کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ پریم چند نے اگر چہ مغربی تکنیک اور وہاں کے ادب سے استفادہ کیا ہے مگر ان کے ابتدائی افسانوں پر بھی داستانوی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ ایک طرف ٹالسٹائی کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف طلسم ہوش ربا کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں رنگینی، تخیل کی بلند پروازی اور وجد آفریں اندازِ بیان ملتا ہے۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے افسانے یعنی 1905 سے 1908 تک کے افسانوں پر یہ اثرات نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بالخصوص ان کے پہلے افسانوی مجموعے کے تمام افسانے داستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہاں پر پریم چند کے ایک افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" کا ذکر ضروری ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ، کردار نگاری، فضاسازی اور اسلوب سب کچھ داستانوی انداز میں ہے۔ یہ افسانہ ایک جذباتی نوجوان دلفگار کی محبت کا تخیلی قصہ ہے، جو دلفریب کی محبت میں مبتلا ہے اور اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار ہے۔ کئی بار ناکام ہونے کے بعد بالآخر ایک قطرہ خون لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جو عاشقِ وطن سے ٹپکا تھا۔

عہد پریم چند کے ابتدائی دور کے افسانوں کے موضوعات اور فن پر ایک طرف داستانوں کا اثر ہے تو دوسری طرف رومانویت پسندی کا ہے۔ یہ دو ایسے رجحان ہیں جن سے اردو کا ابتدائی افسانوی ادب عبارت ہے۔ اس عہد کے اہم افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش اور ل احمد اکبر آبادی کا نام شامل ہے۔

سجاد حیدر یلدرم بنیادی طور پر رومانوی افسانہ نگار تھے۔ ان کے تخلیقی شعور میں رومانوی قدریں رچی بسی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی اور ترکی ادب کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ جس ترکی اور ایرانی ادب سے فیض یاب ہوئے وہ رومانیت اور ادب لطیف کے عناصر سے مملو تھا۔ دوران ملازمت یلدرم نے ترکی ادب کی رومانوی قدروں کا عمیق مطالعہ کیا اور اسے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے ترکی۔ ایرانی اور انگریزی ادب کے جن افسانوں کا ترجمے کیے وہ سب کے سب رومانویت کے زیر اثر لکھے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طبع زاد اردو افسانے بھی رومانویت کے حامل تھے۔ اردو افسانے میں رومانویت یلدرم کے ذریعے آئی اسی لیے انہیں اردو افسانہ نگاری میں رومانیت کا امام کہا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات عموماً عشق و محبت اور عورت کی ذات و کائنات سے تعلق رکھتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم کی روایت کو نیاز فتح پوری نے اور زیادہ وسیع کر دیا۔ ان کا رومانی شعور زیادہ توانا نظر آتا ہے۔ یلدرم کی طرح نیاز فتح پوری نے بھی حسن و عشق، واردات قلب اور عورت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ نیاز فتح پوری کا رومانی شعور یونان کے قدیم تاریخ کے دھندلکوں میں جھانکتا ہے اور یونانی اساطیر سے دلچسپی حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں اکثر و بیشتر یونانی تاریخ و ثقافت کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت مکزی حیثیت کی حامل ہے۔ نیاز عورت اور اس کی ذات کو حسن سرچشمہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عورت ایک سراپا لذت ہے، تسکین ذات کا سبب ہے اور ایک مرئی سحر ہے۔ اسی لیے عورتیں مردوں پر حکمرانی کرتی ہیں۔ عورت کے متعلق نیاز فتح پوری کا یہ تصور ان کت تمام رومانی افسانوں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نیاز فتح پوری نے مذہبی ظاہر داری اور نام نہاد مولویوں کی عیاری کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں گہرا طنز و نشتریت بھی پایا جاتا ہے۔ موضوع و مواد کے اعتبار سے نیاز فتح پوری افسانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو خالص رومانی ہیں، دوسرے وہ جو معاشرتی ہیں اور

تیسرے مذہبی، جن میں انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے صوفیوں اور پیر و مرشد کی شخصیت اوران کے کرامات کو بے نقاب کیا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے یلدرم کے مقابلے ان کے افسانوں میں وسعت پائی جاتی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اور نیاز احمد فتح پوری کے افسانوی روایت سے ل احمد اکبر آبادی کا افسانوی فن تعمیر ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کو رومانوی رجحان سے بامِ عروج پر پہنچایا۔ ل احمد اکبر آبادی آسکر وائلڈ کے نظریہ ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے اصلاحی مقصد کے حامل نہیں ہیں۔ اپنے پیش رو کی طرح ل احمد کے افسانوں میں بھی جذباتی اور وجدانی کیفیت ملتی ہے۔

عہد پریم چند کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام سلطان حیدر جوش کا بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں تہذیبی اور معاشرتی مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے۔ سلطان حیدر جوش نے اپنے عہد کے تہذیبی اور معاشرتی مسائل پر غور و خوص کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی تہذیب ہندوستان پر پوری طرح سے غالب ہو چکی تھی۔ ایک طرف مغربی تہذیب کی رعنائی تھی تو دوسری طرف مشرقی تہذیب کی قدروں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا منظر تھا۔ سلطان حیدر جوش نے انہیں بہت قریب سے سمجھنے کی کوشش کی اور ان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

اس عہد کے افسانہ نگاروں کے یہاں سماجی اور معاشرتی مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے، لیکن ان افسانہ نگاروں نے مسائل کو پیش کرنے کے بجائے گھریلو زندگی میں ان مسائل کے اثر اور رد عمل سے پیدا ہونے والی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو خاص طور پر افسانے کا موضوع بنایا۔ ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات سے اردو افسانہ اپنے ابتدائی دور یعنی رومان سے گزر کر حقیقت کی طرف رواں ہونے لگا تھا۔ 1903 سے 1936 تک کا زمانہ اردو افسانے کے لیے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس عرصے میں اردو افسانہ رومان، اصلاح پسندی سے ہو کر حقیقت سے ہمکنار ہوا اور ''ادب برائے ادب'' نہ رہ کر ''ادب برائے زندگی'' کی ترجمانی کرنے لگا۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور فن، فن کار کی شخصیت اور ان کے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ اس تعلق سے پریم چند کا کہنا ہے کہ:

> ''ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے، جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں، وہی ادب میں اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔''

پریم چند کا یہ بیان اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ اب ''ادب برائے ادب'' نہ رہ کر ''ادب برائے زندگی'' کا عکاس ہوگا اور وہی ادب دیرپا اپنا اثر چھوڑ پائے گا جو حقیقی زندگی کا ترجمان ہوگا۔ اردو افسانے کو عام زندگی سے جوڑنے میں پریم چند نے کلیدی رول ادا کیا۔ پریم چند نے ہندوستانی زندگی بالخصوص دیہی زندگی کی کثیر الجہات کشمکش کو اپنی تخلیقات میں اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ان کے افسانے سماج کا جیتا جاگتا آئینہ بن گیا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان گاؤں میں بستا ہے اور گاؤں ہندستان کے افسانوں میں۔ پریم چند کا یہ عمل نہ صرف ان کے عہد کا بلکہ نئی نسل کے لیے بھی مشعل راہ بن گیا۔

1.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- پریم چند کا عہد (1880–1936) برطانوی راج اور ہندوستانی معاشرے کے اہم سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا دور تھا۔

- پریم چند نے اپنے ادب کے ذریعے عام آدمی کی زندگی، غربت، استحصال اور سماجی ناانصافیوں کو بے نقاب کیا۔
- پریم چند کا زمانہ ہندوستان میں برطانوی استعماریت، قومی تحریک آزادی اور سماجی اصلاحات کا دور تھا۔اس عہد میں ہندوستانی معاشرہ زمینداری نظام، جاگیرداری اور طبقاتی تفریق کا شکار تھا۔
- پریم چند کا ماننا تھا کہ ادب کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ معاشرتی بیداری اور اصلاح ہے۔وہ "ادب برائے زندگی" کے نظریے کے حامی تھے۔
- پریم چندنے ادب کے ذریعے سماج کو آئینہ دکھانے کاکام کیااوراس سے سماج میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ان کاماننا تھاکہ جب تک ادب عوام کے دکھ درد کو نہ چُھوئے،وہ بے روح ہوتا ہے۔
- پریم چند کے عہد میں کئی اہم سیاسی تحریکیں اور واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ہندوستان کی سیاست کا رخ موڑ دیا۔ذیل میں اہم تحریکوں اور واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
- پریم چند کا عہد سیاسی اتھل پتھل کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کا دور تھا۔ان کے افسانے اور ناول اسی عہد کے آئینہ دار ہیں۔اس دور کے سماجی حالات کو سمجھنا پریم چند کے ادب کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔
- پریم چند کے افسانے اور ناول محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک سوچ، ایک پیغام اور ایک تحریک ہیں۔"گئودان"، "نرملا"، "نمک کا داروغہ"، "کفن" اور "پوس کی رات" جیسے شاہکار افسانے اور ناول آج بھی ہمارے معاشرے کی سچائیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔
- پریم چند کے عہد میں بیواؤں کی حالت اس دور میں نہایت تکلیف دہ تھی۔شوہر کی وفات کے بعد ان کی زندگی گویا ختم سمجھی جاتی تھی۔انہیں سادہ لباس، مخصوص غذااور سماجی تقریبات سے کنارہ کشی جیسے سخت اصولوں میں جکڑ دیا جاتا تھا۔
- پریم چندنے اپنے افسانوں اور ناولوں میں عورتوں کی اس حالتِ زار کو نہ صرف نمایاں کیابلکہ ان کے حق میں آواز بھی بلند کی اور "بیوہ"، "نرملا" اور "بازار حسن" جیسے ناول لکھے۔
- پریم چند کا عہد ہندوستانی ادب کا سنہرا دور تھا۔انہوں نے اپنی تحریروں سے نہ صرف ادب کو نیا رنگ دیا بلکہ سماجی تبدیلی کی راہ بھی ہموار کی۔آج بھی ان کی تخلیقات کو ہندوستانی سماج کی عکاسی کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔

1.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
استحصال	:	حصول، حاصل کرنا، ناجائز فائدہ اٹھانا
ترجیحات	:	برتری، بہتری، فضیلت
وقوع پذیر	:	ظاہر ہونا

استعماریت	:	زبردستی کسی قریبی ملک کو اپنے سات ملالینا
تغیرات	:	تبدیلی، بدل دینا
حالتِ زار	:	رونے کی حالت، بری حالت
معیشت	:	آمدنی، فائدہ
تسلط	:	غلبہ، حکومت، زور
مزید برآں	:	اس کے علاوہ، علاوہ ازیں
خود مختاری	:	آزادی، اختیار رکھنے کا عمل
اختصاص	:	خاص کرنا، خصوصیت رکھنا

1.5 نمونۂ امتحانی سوالات

1.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کا عہد کب سے کب تک مانا جاتا ہے؟

(a) 1936–1880 (b) 1936–1920 (c) 1947–1936 (d) 1947–1980

2۔ ہندوستان میں " رولٹ ایکٹ" کب نافذ کیا گیا تھا؟

(a) 1900 (b) 1910 (c) 1919 (d) 1920

3۔ "نمک ستیہ گرہ" کی قیادت کس نے کی تھی۔

(a) پریم چند (b) راجہ رام ہون رائے (c) بال گنگا دھر تلک (d) مہاتما گاندھی

4۔ "نمک ستیہ گرہ" کس سنہ میں چلائی گئی تھی؟

(a) 1930 (b) 1935 (c) 1925 (d) 1920

5۔ " رولٹ ایکٹ" کا دوسرا نام کیا تھا؟

(a) روایت شکن تحریک (b) عدم تعاون تحریک (c) بلیک لا (d) نمک ستیہ گرہ

6۔ ذیل کا کون سا ناول عورتوں کے مسائل پر لکھا گیا ہے؟

(a) گئودان (b) بازارِ حسن (c) اسرار معابد (d) چوگان ہستی

7۔ افسانہ "نصیر اور خدیجہ" کس نے لکھا؟

(a) راشد الخیری (b) پریم چند (c) سلطان حیدر جوش (d) سجاد حیدر یلدرم

8۔ عہد پریم چند میں کس کا شمار نہیں ہوتا؟

(a) سجاد حیدر یلدرم (b) نیاز فتح پوری (c) سعادت حسن منٹو (d) سلطان حیدر جوش

9۔ اردو افسانہ نگاری میں رومانیت کا امام کسے کہا جاتا ہے؟

(a) پریم چند (b) سلطان حیدر جوش (c) نیاز فتح پوری (d) سجاد حیدر یلدرم

10۔ ''نمک کا داروغہ'' کس کا افسانہ ہے؟

(a) پریم چند (b) کرشن چندر (c) سعادت حسن منٹو (d) راشد الخیری

1.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کے عہد پر تبصرہ کیجیے۔

2۔ پریم چند کے عہد کے سیاسی حالات پر نوٹ لکھیے۔

3۔ 1905 کی تقسیم بنگال اور سودیشی تحریک پر روشنی ڈالیے۔

4۔ 1919 کا رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ پریم چند کے عہد میں سماجی استحصالی اور غربت پر تبصرہ کیجیے۔

1.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کے عہد کے سیاسی حالات پر نوٹ لکھیے۔

2۔ پریم چند کے عہد کے سماجی حالات اجاگر کیجیے۔

3۔ پریم چند کے عہد میں اردو افسانے کی صورت حال پر روشنی ڈالیے۔

1.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	پریم چند فن اور تعمیر فن	جعفر رضا
2۔	پریم چند کچھ نئے مباحث	مانک ٹالا
3۔	پریم چند ایک نقیب	صغیر افراہیم
4۔	اردو افسانے کی روایت	مرزا حامد بیگ
5۔	داستان سے افسانے تک	وقار عظیم

1.5.1 کے جوابات:

A-1	C-2	D-3	A-4	C -5
B-6	A -7	C-8	D-9	A-10

اکائی 2: پریم چند کے حالاتِ زندگی

اکائی کے اجزا

2.0		تمہید
2.1		مقاصد
2.2		پریم چند کے حالات زندگی
	2.2.1	پریم چند کی پیدائش وابتدائی احوال
	2.2.2	تعلیم
	2.2.3	شادی اورازدواجی زندگی
	2.2.4	ملازمت
	2.2.5	رسالہ 'ہنس' اور دیگر رسائل کی ادارت
	2.2.6	وفات
	2.2.7	شخصیت
2.3		اکتسابی نتائج
2.4		کلیدی الفاظ
2.5		نمونہ امتحانی سوالات
	2.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	2.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	2.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
2.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

پریم چند کی ولادت سے قبل ہندوستان میں انگریزی حکومت کا تسلط ہو چکا تھا۔ فرانس کی نو آبادیاں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئی تھیں اور اس نے بیشتر ممالک پر اپنے اثرات ثبت کر دیے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں بہت سے انقلابات رونما ہوئے جن میں فرانس کا سیاسی انقلاب، انگلینڈ کا صنعتی انقلاب اور روس کا سرخ انقلاب شامل ہیں۔ ان انقلابات نے دنیا کے مختلف ممالک کو اپنے طور پر متاثر

کیااور ساتھ ہی ساتھ سائنسی ترقی نے جہاں معاشرہ پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ اسی عہد میں 31/ جولائی 1880ء میں بنارس کے قریب لمہی نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں پریم چند پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی پس منظر بہت سیدھا سادا تھا، ان کے والد ایک غریب کاشتکار تھے، لیکن کھیتی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے، لہٰذا انھوں نے ڈاک خانے میں ملازمت اختیار کرلی۔ پریم چند کی پوری زندگی عسرت، مفلسی اور کسمپرسی میں گزری، وہ تمام عمر معاشی مسائل کا سامنا کرتے رہے۔ بچپن، دورانِ تعلیم یہاں تک کہ ملازمت کے وقت بھی انھیں سکون نہیں نصیب ہوا۔ ملازمت کے دوران پے درپے تبادلوں اور بیماری کے سبب دن بدن ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ ان کی ازدواجی زندگی بھی اطمینان بخش نہیں گزری، پھر بھی انھوں نے اردو ادب میں جو قابلِ قدر خدمات انجام دیں، انھوں نے پریم چند کو لافانی بنادیا۔ انھوں نے بہت سے رسائل وجرائد کی ادارت بھی کی اور اپنا ایک رسالہ 'ہنس' کے نام سے جاری کیا۔ انھوں نے کتابوں کی معیاری اشاعت کے لیے پریس کا قیام بھی کیا۔ پریم چند سادہ لوح، مخلص، منکسر المزاج، اتحاد ویگانگت کا پیکر، مخلص اور نہایت شریف انسان تھے۔ انھوں نے پوری زندگی ایک سچے ہندوستانی کی طرح بسر کی۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ جن میں ہندو، مسلمان، سکھ اور تقریباً ہر مذہب ومسلک کے لوگ تھے۔ وہ روشن دماغ اور اپنی اعلیٰ ذہانت واعلیٰ خیالات سے لوگوں میں حد درجہ مقبول تھے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے مطالعے کے بعد طلبا اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- پریم چند کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات سے واقف ہو سکیں۔
- پریم کی تعلیم وتربیت اور پرورش وپرداخت سے آشنا ہو سکیں۔
- پریم چند کی ازدواجی زندگی کے بارے میں جان سکیں۔
- پریم چند کی ملازمتوں اور روزگار کے بارے میں جان سکیں۔
- پریم چند کے رسالہ 'ہنس' اور دیگر رسائل وجرائد کی ادارت کے بارے میں بیان کر سکیں۔

2.2 پریم چند کے حالات زندگی

2.2.1 پریم چند کی پیدائش وابتدائی احوال

پریم چند کی تاریخِ پیدائش میں قدرے اختلاف ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند کی تاریخ پیدائش 21/ جولائی 1880ء بتائی ہے۔ بعض لوگوں نے 1899ء، جب کہ لوگوں نے 1881ء بتائی ہے۔ لیکن تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ پریم چند کا جنم 31/ جولائی 1880ء میں بنارس سے تقریباً چار پانچ میل کے فاصلے پر آباد ایک نہایت ہی پسماندہ اور غیر معروف گاؤں لمہی میں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں مانک ٹالا لکھتے ہیں:

(1) "میٹرک انٹر کے امتحان 1899ء کے سرٹیفکٹ بتاریخ 20/ فروری 1899ء کو جب یہ سرٹیفکٹ ایشو ہوا تھا، اس کے مطابق دھنپت

رائے کی عمر سترہ سال اور چار ماہ کی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق وہ 20/ اکتوبر 1881ء کو پیدا ہوئے تھے۔"

(2)"دوسری تاریخ ان کے سروس ریکارڈ میں ملتی ہے، اس میں 4/ اگست 1881ء درج ہے۔ یہ دونوں الگ الگ تاریخیں کس طرح درج ہوئیں کس نے اور کیسے درج کرائیں اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

(3)ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کے مطابق ان کی جنم پتری کے حساب سے ان کی پیدائش 31/ جولائی 1880ء کو ہوئی تھی۔"

پریم چند کے آبا واجداد کا تعلق کائستھ خاندان سے تھا۔ پریم چند کے والد عجائب لال پوسٹ آفس میں محض 20 روپئے ماہوار پر بحیثیت منشی کام کیا کرتے تھے۔ پریم چند کی پیدائش پر بہت زیادہ خوشیاں منائی گئیں کیونکہ تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ تیسرے بیٹا ہونے کی وجہ سے "تیترے" کہلائے۔ والد نے ان کا نام دھنپت رائے تجویز کیا لیکن ان کے چچا اور دیگر گھر والے 'نواب رائے' کے نام سے پکارتے تھے۔ پریم چند کی ابتدائی زندگی غربت اور کسمپرسی میں بسر ہوئی۔ ابتدائی زندگی کے بعد بھی انھیں بہت زیادہ محنت اور جدوجہد کرنا پڑی۔ بچپن، جوانی اور پیری تک کے حالات بہت کٹھنائیوں میں گزرے۔ پریم چند کی والدہ آنندی دیوی نیک سیرت، پاک طبیعت، عمدہ عادات واطوار اور سب سے محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ وہ اپنی مخلصانہ طبیعت اور عمدہ مزاج کی وجہ سے خاندان کو ایک ڈور میں سمیٹے ہوئے تھیں لیکن ابھی پریم چند محض آٹھ ہی برس کے تھے کہ ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی۔ دھیرے دھیرے ان کے مرض نے اتنا طول پکڑا چھ مہینے تک بستر سے اٹھ نہ سکیں۔ علاج ومعالجہ کے ساتھ ساتھ ان کے مرض میں اضافہ ہی ہوتا رہا، جس نے آخری دم تک پیچھا نہیں چھوڑا اور انجام کار وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ والدہ کی موت کے بعد دادی نے پرورش وپرداخت کی، لیکن جلد ہی وہ بھی راہیٔ ملک عدم ہوئیں۔ والدہ کی موت سے خاندان کا شیرازہ منتشر ہو گیا لیکن ایسی تاسف کی گھڑی میں پریم چند خاموش تھے کیونکہ اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی اور وہ حالات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس عظیم سانحہ کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ صرف خاموشی سے ہر شے کو تکتے رہتے تھے لیکن جوں جوں ان کی عمر بڑھتی گئی، انھوں برسوں قبل ہونے والے ماں کی جدائی کے صدمہ کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ وہ والدہ کو یاد کرکے اکثر رویا کرتے تھے، ماں کے نہ ہونے سے وہ خود بالکل تنہا محسوس کرتے اور اکثر مایوسی کا شکار بھی ہو جاتے۔ والدہ کے انتقال کے صرف برس بعد ہی ان کے والد نے نکاح ثانی کر لیا۔ سوتیلی ماں کا رویہ پریم چند کے ساتھ اچھا نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بعض افسانوں میں سوتیلی ماں کے کردار کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اسی قبیل کا ایک افسانہ "علاحدگی" ہے۔

پریم چند کا بچپن اتنے مصائب اور حادثات میں گزرا کہ تمام عمر ان کے ذہن سے وہ حادثات محو نہ ہو سکے اور نقش بن کر ان کی زندگی پر ثبت ہو گئے۔ سب سے عظیم واقعات میں بچپنے میں ہی والدہ کا انتقال تھا۔ اس کے بعد دادی اور والد کے انتقال نے انھیں حد درجہ توڑ کر رکھ دیا تھا۔ والد کے نکاح ثانی کے بعد ان کی سوتیلی ماں سے ملنے والی اذیتیں اور بے اعتنائی سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

2.2.2 تعلیم

پریم چند جب سات یا آٹھ برس کی عمر کو پہنچے تو ان کا داخلہ گاؤں سے سوا میل کی دور پر واقع لال پور کے ایک مدرسہ میں کرا دیا گیا، جہاں ایک مولوی سے پریم چند نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ جعفر رضا لکھتے ہیں:

"نواب رائے کی تعلیم کا سلسلہ آٹھ سال سال کی عمر سے شروع ہوا۔ اردو اور فارسی کی تعلیم کائستھوں میں عام رواج تھا۔ دستور کے مطابق اپنے گاؤں سے تھوڑی دور پر دوسرے گاؤں لال پور میں ایک مولوی صاحب سے پڑھنا شروع کیا۔ اصلاً درزی کا کام کرتے تھے اور فرصت کے اوقات میں مکتب بھی چلاتے تھے، طریقۂ تعلیم بھی وہی ہو گا جو عموماً اس دور میں رائج تھا۔ سبق یاد کرنا اور استاد کی خدمت کرنا پریم چند کے ذہن پر ان مولوی صاحب کی تصویر ہو گئی جو بعد میں ان کہانیوں میں ابھری۔" (پریم چند کہانی کار رہنما، ڈاکٹر جعفر رضا، ص:34)

لیکن ان کا دل تعلیم میں نہیں لگتا تھا۔ وہ کھیل کود میں زیادہ شغف رکھتے تھے۔ وہ گلی ڈنڈا، پتنگ بازی اور کھیتوں سے گنے توڑ کر چوسنے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ مکتب جانے اور پڑھنے جانے کے بجائے وہ سارا وقت کھیتوں کے سیر سپاٹے میں گزار دیتے اور کئی کئی دن تک مدرسہ سے غیر حاضر رہتے۔ چودہ سال کی عمر میں ان کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا، جہاں ان کا داخلہ ایک مشن اسکول کی چھٹی جماعت میں ہوا۔ یہیں سے ان کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ 1897ء میں پریم چند کے والد بھی ایک لمبی بیماری کے بعد فوت ہو گئے۔ اب گھر کے اخراجات پورے کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لہٰذا والد کی وفات کے بعد پریم چند اور ان کے گھر والوں کو معاشی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ پریم چند اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے خواہش مند تھے لہٰذا والد کی وفات اور اس کے نتیجہ میں در آنے والی تنگ دستی نے تعلیم کے سارے راستے مسدود کر دیے تھے، پھر بھی انھوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس درمیان انھوں نے میٹرک کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں ساتھ پاس کر لیا۔ پریم چند کے زمانہ میں کالج میں صرف فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے طلباء کی فیس معاف ہوتی تھی، جس کے دائرہ میں پریم چند نہیں آتے تھے۔ پھر بھی پریم چند ایک بار سوخ ٹھاکر کی سفارش کے ساتھ کالج پہنچے اور داخلہ لینے کی کوشش کی، البتہ حساب میں کمزور ہونے کے باعث داخلہ نہیں مل سکا۔ وہاں سے کبیدہ خاطر ہو کر لوٹے لیکن مایوس نہیں ہوئے اور داخلے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ گزر اوقات کے لیے انھوں نے ایک وکیل کے بچوں کو پانچ روپے ماہانہ کے عوض ٹیوشن پڑھانا شروع کیا، جس میں سے آدھے پیسے گھر بھیج دیتے تھے اور آدھے سے اپنا گزر بسر کرتے تھے۔ اتنی قلیل آمدنی میں گھر کا اور اپنا خرچ چلانا مشکل تھا، اس کے لیے انھیں ہر مہینہ قرض لینا پڑتا تھا۔ انھیں ایام میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہیں اپنی جمع شدہ کتابیں فروخت کر کے اخراجات پورے کرنے پڑے۔

2.2.3 شادی اور ازدواجی زندگی

محض پندرہ سال کی عمر میں 1895ء میں پریم چند کی شادی رام پور ضلع بستی کے ایک زمیندار گھرانے کی لڑکی سے کر دی گئی۔ یہ رشتہ ان کے سوتیلے نانا نے طے کرایا تھا۔ اس وقت پریم چند معاشی بدحالی کا شکار تھے اور تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گھر اور تعلیم کے اخراجات کے ساتھ بیوی کے آجانے سے مزید پریشانیاں بڑھ گئی تھیں۔ ان کی بیوی کا مزاج جھگڑالو تھا، جس کے نتیجے میں ان کی زندگی اور بھی تلخ ہو کر رہ گئی۔ امرت رائے ان کی بیوی کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بھدی تھتھل، پھوہڑ، اتنا ہی نہیں ان کے چہرے پر چیچک کے گہرے داغ تھے اور ایک ٹانگ

بھی چھوٹی تھی، جس کی وجہ سے غریب کو بھچک کر چلنا پڑتا تھا۔ مہینہ میں ایک آدھ بار ہوائی بھی ضرور تھیں، ان پر بھوت پریت آتے تھے۔ سنتے ہیں دماغ میں کچھ خلل بھی تھا۔ کیونکہ لڑائی ہونے پر اپنے شوہر سے کہتی تھیں، ہم تمھیں گدھا چھاننے کے بگے سے باندھ کر منگالیں گے۔ ایسے ایسے جادوٹونے ہیں ہمارے پاس۔" (پریم چند قلم کا سپاہی، امرت رائے، ص:34)

پریم چند کی اہلیہ کی تربیت درست نہج پر نہیں ہوئی تھی یہی وجہ تھی کہ اس کے اندر چڑچڑاپن اور ضد در آئی تھی۔ اس کے مظالم کا نشانہ پریم چند کو بننا پڑ رہا تھا۔ ان کی اپنی ہی بیوی ان کا استحصال کر رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ گھر کو سنجوئے رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی بیوی کا رویہ بدل جائے گا لیکن یہ ان کی خوش فہمی ہی رہی۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کی بیوی کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ تیز مزاجی، تلخ کلامی، طبیعت میں چڑچڑاپن طنز کرنے اور روٹھنے کی عادت میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ پریم چند نے بہت حد تک برداشت کیا لیکن جب بیوی کی زیادتیاں حد سے بڑھتی گئیں تو پریم چند کو یقین ہو گیا کہ اب اہلیہ کے ساتھ نباہ کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: "جب تم میرے ساتھ سکھی نہیں رہ سکتی تو میں زبردستی کیوں پڑا رہوں اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ تم اور میں الگ ہو جائیں میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا تم جیسی ہو ویسی ہی رہو گی پھر خوش حال زندگی کی امید کیسی! لیکن پریم چند کی اہلیہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کی زیادتیاں اور جھگڑے بڑھتے ہی رہے۔ ایک دن جھگڑا اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ ان کی بیوی نے مائیکے جانے کی زد پکڑلی اور خودکشی کرنے کی بھی کوشش کی۔ ان گھریلو مسائل پر پریم چند اپنے ایک خط میں دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں کہ:

"برادرم! اپنی بیتی کس سے کہوں! ضبط کیے کیے کوفت ہو رہی ہے، جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا خانگی تردد ات کا تانتا بندھا۔ عورتوں نے ایک دوسرے کو جلی کٹی سنائی۔ ہماری مخدومہ نے جل بھن کر گلے میں پھانسی لگالی۔ ماں نے آدھی رات کو بھانپا، دوڑیں، اس کو رہا کیا۔ صبح ہوئی میں نے خبر پائی، جھلایا بگڑا، لعنت ملامت کی، بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ اب یہاں نہ رہوں گی، میکے جاؤں گی میرے پاس روپیہ نہ تھا، چار کھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی۔ وہ رودھو کر چلی گئیں میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا آج ان کو گئے آٹھ روز ہو گئے، نہ خط، نہ پتر، میں ان سے پہلے ہی ناخوش تھا، اب تو صورت سے بیزار ہوں۔ غالباً اب ان کی جدائی دائمی ثابت ہو، خدا کرے، ایسا ہی ہو میں بلا بیوی کے رہوں گا۔"

بالآخر پریم چند نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ فتحپور کے قریب سلیم پور کے ایک زمیندار کی بیٹی شورانی دیوی جن کی شادی بچپن میں ہو گئی تھی بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں، کے والد نے اپنی بیٹی کی دوسری شادی کرنے کا اشتہار دیا۔ پریم چند کی نظر ایک اشتہار پر پڑی جس پر لکھا تھا کہ سلیم پور کے منشی دیوی پرساد اپنی ودھوا بیٹی کی شادی کرنا چاہتے ہیں، خواہشمند حضرات دیے گئے پتے پر رابطہ قائم کریں۔ پریم چند نے فوراً خط لکھا۔ انھوں نے یہ فیصلہ لے کر مذہب اور سماج دونوں کے خلاف بغاوت کا قدم اٹھایا کیونکہ اس وقت بیواؤں کی شادی کی سخت ممانعت تھی اور معاشرہ میں بیواؤں کو اچھا مقام حاصل نہیں تھا بلکہ بیوہ عورتیں ایک مردے جیسی زندگی جینے پر مجبور

تھیں۔ ایسے معاشرہ میں بیوہ سے شادی کرنا کسی بغاوت سے کم نہ تھا لیکن پریم چند بھی قوت فیصلہ میں پختہ تھے، اور ایک نئی روایت کے خواہاں بھی۔ چنانچہ انھوں نے صدیوں سے چلی آرہی بیوہ کا دوسرا نکاح نہ ہونے کی روایت کو توڑ دیا اور معاشرہ کی سخت مخالفت کے باوجود انھوں نے ایک بیوہ عورت (شورانی دیوی) سے شادی کرلی۔

2.2.4 ملازمت

شادی کے بعد گھر اور تعلیم کے اخراجات سے پریشان ہو کر پریم چند کو ملازمت کرنے کا خیال آیا۔ اس دوران 1899ء کو ان کی ملاقات ایک مشنری اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ہوئی، ان کو اپنے اسکول کے لیے ایک استاد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انھوں نے پریم چند کو استاد کی حیثیت سے اپنے یہاں ملازمت دے دی اور تنخواہ اٹھارہ (18) روپئے ماہوار متعین کی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور انٹر کے امتحانات میں شریک ہوئے، لیکن ریاضی کا مضمون لازمی ہونے کی وجہ سے وہ پاس نہ ہوسکے۔ جولائی 1902ء میں انھیں کالج کی طرف سے ٹریننگ کی غرض سے ٹریننگ کالج الہ آباد بھیجا گیا۔ اس طرح انھیں تعلیم جاری رکھنے کا ایک اور سنہرا موقع نصیب ہوا۔ یہاں انھوں نے دوسال میں جونیر انگلش ٹیچرس سرٹیفکٹ کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ ٹریننگ کی تکمیل کے بعد مئی 1904ء میں پریم چند دوبارہ ڈسٹرکٹ اسکول پرتاپ گڈھ واپس گئے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ الہ آباد ہو گیا اور انھوں نے فروری 1905ء سے مئی 1905ء تک الہ آباد ماڈل اسکول میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ ماڈل اسکول میں چند ماہ رہنے کے بعد ہی مئی 1905ء میں کانپور تبادلہ ہو گیا۔

1909ء میں پریم چند کا تبادلہ مہوبہ ضلع ہمیرپور ہو گیا جہاں ترقی پاکر بحیثیت سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہاں ان کا زیادہ تر وقت دیہی علاقوں کا دورہ کرتے گزرتا تھا۔ اس طرح انھیں ایک بار پھر سے کاشتکاروں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ ہمیرپور میں قیام کے دوران پریم چند کو پیچش کی شکایت ہوئی اور علاج کے باوجود بھی کوئی افاقہ نہ ہوا لہٰذا 1914ء میں انھوں نے تبادلے کے لیے عرضی پیش کی لیکن ان کا تبادلہ روہیل کھنڈ کے بجائے بستی کر دیا گیا۔ بستی پہنچ کر ان کے مرض میں مزید اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا وہ چھ ماہ کی تعطیل پر بغرض علاج کانپور اور لکھنؤ میں اقامت پذیر رہے اور طبیعت میں درستگی آگئی لیکن تعطیل کے جب دوبارہ بستی پہنچے تو ان کی حالت پھر بگڑ گئی۔ بالآخر انھوں نے درخواست دی کہ انھیں ڈپٹی انسپکٹر مدراس کے بجائے مدرس کے عہدہ پر فائز کر دیا جائے۔ ان کی یہ درخواست منظور کرلی گئی اور مئی 1915ء سے اسسٹنٹ ماسٹر کی حیثیت سے گورنمنٹ ہائی اسکول بستی میں خدمات انجام دینے لگے۔ اگست 1916ء میں پریم چند کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا جہاں وہ 1921ء تک مقیم رہے۔ اس دوران انھیں ملکی سطح پر ادبی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ 1921ء میں جب گاندھی جی ملک کا دورہ کرتے ہوئے گورکھپور پہنچے اور لوگوں سے عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لینے کی گذارش کی تو پریم چند بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ وہ گاندھی جی کی تقریر سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے فروری 1921ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گاندھی جی کے معاون کے طور پر کام کرتے رہے۔

استعفیٰ دینے کے بعد پریم چند کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ گھر کے اخراجات کا تھا۔ ساتھ ہی ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی چلی

جارہی تھی۔ مسلسل علاج کے باوجود مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ ان تمام حالات کے باوجود انھوں نے اپنا استعفیٰ انگریزی حکومت کے سامنے پیش کر دیا۔ استعفیٰ دینے کے بعد اپنے ایک دوست کے پاس منی رام چلے گئے، جہاں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور اس کے ساتھ اپنے دوست مہاویر پرشاد کے ساتھ چرخے بنوانے کا کام بھی کرنے لگے۔ چرخے کے کاروبار میں زیادہ فائدہ تو نہیں ہوا لیکن ان کی صحت کے لیے یہ جگہ کافی بہتر ثابت ہوئی۔ یہاں ان کی طبیعت کافی حد تک سنبھلنے لگی۔

2.2.5 رسالہ 'ہنس' اور دیگر رسائل کی ادارت

جب پریم چند تبادلہ ہو کر کانپور آئے تو یہاں ان کا قیام دیانرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کے یہاں رہا۔ اس دوران دونوں میں ایسے تعلقات استوار ہو گئے تھے جو آخری دم تک قائم رہے۔ تصنیف و تالیف کا کام یہاں بہت عروج پر رہا۔ کانپور میں ان کی زندگی بہت پُر کیف طریقے سے بسر ہوئی۔ گویا کانپور نے پریم چند کو پریم چند بنایا۔ کانپور آکر پریم چند نے رسالہ 'زمانہ' میں لکھنا شروع کیا۔ اسی طرح ان کی ادبی و علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے صرف ناول اور افسانے ہی نہیں لکھے بلکہ اصلاحی و سوانحی ناول، اور ادبی تبصرے بھی تحریر کیے۔ یہاں کے قیام سے ان کے اندر سماجی اور سیاسی شعور پیدا ہوا اور حب الوطنی کے جذبہ سے وہ کانپور ہی میں سرشار ہوئے۔ زمانہ پریس کانپور سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' شائع ہوا، جس میں انھوں نے پہلی مرتبہ پریم چند نام کے بجائے نواب رائے قلمی نام کا استعمال کیا۔

پریم چند کے بنارس کے قیام کے دوران ایک ہندی رسالہ 'مریادا' نکلتا تھا، جس کے ایڈیٹر بابو سمپورن آنند تھے۔ جب ان کو عدم تعاون تحریک کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا تو پریم چند کا بطور ایڈیٹر انتخاب عمل میں آیا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سال تک محنت و لگن کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے رہے۔ اس دوران ان کو بھی پبلشنگ کے کام سے واقفیت ہو گئی، اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنا ذاتی پریس قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ رسالہ 'مریادا' سے علاحدہ ہوئے انھوں نے تدریسی کام کے بعد چھپائی کا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ادبی لحاظ سے اس وقت ہندوستان میں ایک بھی پبلشنگ ہاؤس نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنا خود کا ایک ادبی و سیاسی رسالہ جاری کریں۔ جس کے ذریعے وہ تحریک آزادی کی اہمیت کو عام لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان تمام باتوں کو انجام دینے کے لیے ظاہر ہے روپیوں کی ضرورت پڑے گی۔ پریم چند کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اکیلے اس کا بوجھ اٹھا سکیں۔ لہٰذا انھوں نے اس کام کو انجام دینے کے لیے اپنے دوستوں کو حصے دار بنایا۔ خود انھوں نے اس میں ساڑھے چار ہزار روپیہ لگائے اور بہت محنت کے بعد 1933ء کو 'سرسوتی' نام سے ایک پریس قائم کیا۔ اسی پریس سے ان کے ناول 'پردہ مجاز'، 'غبن'، 'میدان عمل' اور 'گئودان' کے ہندی ایڈیشن شائع ہوئے۔

پریس کو کامیاب بنانے کے لیے پریم چند نے بہت جدوجہد کی، جس کے سبب ان کی صحت خراب ہونے لگی لیکن اس پریس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا بلکہ نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ پریس میں جو حصے دار تھے وہ اپنا اپنا حصہ لے کر علاحدہ ہو گئے۔ اس پریس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پھر بھی مسلسل نقصان کے باوجود پریم چند پریس بند کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ ان حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے اور پریس چلاتے رہے لیکن جب انھیں احساس ہو گیا کہ پریس کی اتنی کم آمدنی سے معمولی اخراجات بھی پورے نہیں ہو رہے تو 1925ء کو لکھنؤ چلے آئے، یہاں آکر ان کو گنگا پستک مالا میں ملازمت کر لی۔ تقریباً ایک سال تک نصابی کتابوں کا کام

انجام دیتے رہے۔ دوبارہ بنارس میں واپس آکر پریس کا کام کیا اور اس کو کامیاب بنانے کی مسلسل سعی کرتے رہے لیکن اس مرتبہ بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ 1929ء کو پھر ملازمت کی غرض سے بنارس سے لکھنؤ آگئے۔ یہاں آکر نول کشور پریس سے نکلنے والے ماہنامہ 'مادھوری' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس رسالے کے ذریعے انھیں اپنی مدیرانہ صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کا سنہرا موقع ملا اور ساتھ ہی رسالہ مادھوری کو کافی اہمیت و مقبولیت بھی ملی، لیکن اس کے باوجود وہ اس میں اپنے سیاسی نظریات کو پیش نہ کر سکے۔ ان کا اصل مقصد ہندوستان کی آزادی تھا، لہٰذا اس رسالے کے توسط سے وہ تحریک آزادی سے متعلق اپنے نظریات کی تشہیر کرنا چاہتے تھے لیکن بعض مصالح کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکے۔ چنانچہ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے 1930ء کو سرسوتی پریس سے اپنا رسالہ 'ہنس' جاری کیا۔ اور پوری توجہ کے ساتھ ہنس کی تربیت کا کام انجام دینے لگے، جس کی بدولت چند عرصے میں ہنس نے ہندی زبان میں معیاری ادب کی روایت قائم کر دی اور ادبی رسالوں میں انفرادی مقام حاصل کر لیا۔ پریم چند نے اپنے رسالے کے ذریعے نوجوان لکھنے والوں کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ اس کا اداریہ وہ خود لکھتے، اس میں انھوں نے ملک کے سماجی، سیاسی اور ادبی مسائل پر اپنے خیالات و نظریات کو بے خوف ہو کر پیش کیا۔ ہنس کے اجرا کے کچھ دنوں بعد ہی ہفتہ وار پرچہ 'جاگرن' بھی نکالنا شروع کی، لیکن معاشی دشواری کی وجہ سے انھوں نے اکتوبر 1936ء میں اپنا رسالہ ہنس ہندی ساہتیہ پریشد کو دے دیا۔ 'ہنس' اور 'جاگرن' کی اشاعت سے پریم چند کو ہر مہینے دو سو روپئے کا نقصان ہو رہا تھا پھر بھی انھوں نے ان رسالوں کا کام جاری رکھا۔ ادب اور وطن کی خدمت کے لیے انھوں نے بہت سی تکالیف و نقصانات برداشت کیں کیونکہ انھیں ادب اور اپنے ملک سے بے حد محبت تھی۔

1934ء میں ایک فلمی کمپنی نے کہانیاں لکھنے کے لیے مدعو کیا اور نو ہزار مشاہرہ دینا طے کیا۔ پریم چند نے محسوس کیا کہ اپنے خیالات و نظریات عوام تک پہنچانے کا یہ ایک اچھا پلیٹ فارم ہے۔ اس کے علاوہ آمدنی بھی معقول تھی، جس سے ہنس اور جاگرن میں ہونے والے نقصان کی تلافی بھی کی جا سکتی تھی، لہٰذا وہ بمبئی آگئے۔ یہاں انھوں نے پہلی کہانی 'مل مزدور' لکھی لیکن حکومت نے مل مالکوں کی وجہ سے اس کی نمائش میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دیں، لہٰذا یہ فلم کامیابی ہمکنار نہ ہو سکی۔ پریم چند فلمی دنیا سے نالاں ہو کر مئی 1935ء میں بنارس واپس چلے گئے۔

1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت کے لیے سجاد ظہیر نے پریم چند کو مدعو کیا تھا چنانچہ پریم چند نے ہندی سمیلن لاہور اور ہندی پرچار سبھا حیدرآباد دکن کی صدارت کو چھوڑ کر انجمن ترقی ہند مصنفین کی کانفرنس کی صدارت قبول کی۔ اس جلسہ میں انھوں نے ادب اور دیگر شعبوں کے باہمی تعلق پر اپنے جو خیالات پیش کیے۔ وہ اپنی جامعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اس تحریک کا منشور سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں انھوں نے پہلی مرتبہ ادب اور سماج، ادب اور سیاست، ادب اور جمالیات جیسے اہم مسائل پر عالمانہ و فاضلانہ گفتگو کی۔ اسی خطبہ میں پریم چند نے ادب کی غایت اور اس کے سماجی مقاصد کی حدیں بھی متعین کیں۔

2.2.6 وفات

بمبئی کے دورانِ قیام سے ہی ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی، بنارس واپسی پر بھی ان کی صحت میں کوئی درستگی نہ آئی۔ بیماری کے

ابتدائی مراحل ہی میں گورکی کے انتقال کی خبر سنی۔ اس سے پریم چند بہت متاثر ہوئے اور بیماری کے باوجود جانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن واپسی میں طبیعت مضمحل ہو گئی۔ انجمن ترقی پسند کانفرنس کے دو مہینے بعد ان کی بیماری میں بہت اضافہ ہو گیا تھا، یہاں تک کہ ایک دن خون کی الٹی بھی ہوئی، چہرہ زرد پڑ گیا، اکثر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا، اتنی کمزور حالت میں بھی وہ لکھتے رہے۔ نامکمل ناول 'منگل سوتر' کے کئی ابواب اسی نازک حالت میں لکھے۔ راتوں کو نیند بھی نہیں آتی تھی، ساری رات بیٹھے بیٹھے گزار دیتے۔ شورانی دیوی ان کے ساتھ جاگتی رہتیں۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ 25/ جولائی کو رات کے ڈھائی بجے خون کی قے ہوئی، جس کے سبب کافی خون بہہ گیا اور کمزوری بھی آ گئی۔ شدید نقاہت کی وجہ سے ان پر مستقل غشی کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ شورانی دیوی نے بنارس کے معالجوں کو دکھایا لیکن جب ان کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو لکھنؤ لے جایا گیا۔ دس گیارہ دن وہاں رہ کر علاج کرتے رہے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا لہٰذا بنارس لوٹ گئے۔ اب کمزوری میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ چلنے پھرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ بستر پر خاموشی سے لیٹے رہتے، پیٹ میں درد ہوتا تو بے چین ہو جاتے۔ اسی ایام میں انھیں اطلاع ملی تھی کہ ہنس کے کسی مضمون کو قابلِ اعتراض قرار دے کر حکومت نے ضمانت طلب کی ہے پریشد کے لوگوں نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس بات سے پریم چند کو بہت دکھ ہوا، کیونکہ انھوں نے ہنس کے لیے بہت جدوجہد کی تھی۔ وہ صحافت کے تئیں حد درجہ دلچسپی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ آخری ایام میں بھی انھوں نے 'بیسویں صدی' کے اجرا کا منصوبہ بنالیا تھا۔ اختر حسین کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "میں قریب ایک ماہ سے بیمار ہوں۔ معدے میں گیسٹرک السر کی شکایت ہے۔ منہ سے خون آتا ہے، اس لیے کام نہیں کرتا، دوا کر رہا ہوں مگر ابھی تک کوئی افاقہ نہیں، اگر بچ گیا تو 'بیسویں صدی' نام کا رسالہ اپنے لوگوں کے خیالات کی اشاعت کے لیے ضرور نکالوں گا۔ ہنس سے میرا تعلق ٹوٹ گیا میں بھی خوش ہوا۔ ہنس جس لٹریچر کی اشاعت کر رہا تھا وہ ہمارا نہیں ہے۔ وہ تو وہی بھگتی والا مہاجنی لٹریچر ہے جو ہندی زبان میں کافی ہے۔"
>
> (پریم چند کہانی کار ہنما، ڈاکٹر جعفر رضا، ص:88)

بالآخر 8/ اکتوبر 1936ء صبح ساڑھے بجے اردو زبان و ادب کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

2.2.7 شخصیت

پریم چند پستہ قامت دبلے پتلے آدمی تھے، مگر مضبوط پنجہ کھولنے پر انگلیوں کو موڑنا معمولی انسان کے لیے آسان نہ تھا۔ ان کا رہن سہن سادہ تھا، اچکن کا پاجامہ یا کھلے ہوئے گلے کا لمبا کوٹ پہنتے تھے۔ اس زمانہ میں غیر ملکی فیشن کا غلغلہ نہیں تھا۔ عام طور پر ہندستانی ٹوپی یا صافہ ہوا کرتا تھا، جس طرح پریم چند کی وضع قطع سادہ تھی، اسی طرح آپ کے عادات واطوار اور اخلاق بھی تصنع اور دکھاوے سے مبرا تھے۔ خلوص آپ کا ہمیشہ شعار رہا، آواز بلند تھی مگر خواہ مخواہ کسی پر رعب نہیں ڈالتے تھے۔ زندگی میں انھوں نے کسی سے لڑائی یا بحث ومباحثہ نہیں کیا۔ ملازمین کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتے تھے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر خوش اخلاق، صلح کن، ہمدرد

اور خوددار انسان تھے۔ وہ سادہ لوح، منکسر المزاج، شگفتہ مزاج، شیریں گفتار، خلوص اور محبت سے سے لبریز دل کے مالک تھے۔ وہ نہایت شریف انسان تھے اور پوری زندگی لوگوں کو انسانیت کا درس دیتے رہے۔ وہ لوگوں سے بہت خلوص اور ادب سے ملتے اور ان کی باتوں کو دلچسپی سے سنتے۔ وہ بڑے بذلہ سنج واقع ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی باتوں کو مزے لے لے کر سنتے۔ وہ ایسے شخص تھے جو اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھتے تھے۔ ان کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا تھا کہ میری وجہ سے کسی کو اذیت نہ ہو۔ وہ زندہ دل اور رحم دل انسان تھے۔ وہ اصول وضوابط پر عمل کرنے والے انسان تھے۔ انھوں نے پوری زندگی ایک سچے ہندوستانی کی طرح گزاری۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ جن میں ہندو، مسلمان، سکھ اور تقریباً ہر مذہب ومسلک کے لوگ تھے۔ وہ روشن دماغ اور اپنی اعلیٰ ذہانت واعلیٰ خیالات سے لوگوں میں حد درجہ مقبول تھے۔ عام لوگوں کے تئیں ان کے دل میں ہمدردی و دردمندی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ پریم چند کی اسی حساسیت نے انہیں ایک بڑا افسانہ نگار بنادیا۔ ابتدا میں پریم چند نے اپنی تحریروں میں جادوئی دنیا پیش کی تھی لیکن بعد میں ان کی توجہ کا سارا مرکز سماجی موضوعات پر رہا، جس سے ان کی تحریروں میں پختگی پیدا ہوگئی۔

طالب علمی کے ایام سے ہی پریم چند کو داستانی ادب اور ناولوں کا مطالعہ کرنے اور لکھنے کا شوق تھا۔ وہ ایک تمبا کو فروش کی دکان پر بیٹھ کر ''طلسم ہوش ربا'' کے نہ ختم ہونے والے قصے سنتے تھے۔ تقریباً ایک سال تک پریم چند اس کے قصے سنتے رہے، جس سے ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہونے کے ساتھ ان کے ادبی ذوق کی نشوونما ہوئی۔ نتیجتاً انھوں نے اس وقت اردو میں موجود تمام افسانے اور ناول پڑھ ڈالے۔ داستانوں کے علاوہ پریم چند کو ناولوں اور افسانوں سے خاصی دلچسپی تھی۔ یہاں تک کہ اس عہد میں اردو زبان میں جتنے بھی ناول اور افسانے موجود تھے، وہ سب کا مطالعہ کر چکے تھے۔ پریم چند کی گھریلو زندگی بھی عام لوگوں کی ہی طرح تھی۔ وہی تنگ دستی، رہن سہن او ربودوباش کا دیہی اور کاشتکاروں جیسا ماحول۔ پھر بھی انھوں نے ایک خوش وخرم گزاری۔ یہ ان کا اعلیٰ ظرف ہی تھا کہ تنگدستی اور مالی مشکلات میں رنجیدہ اور افسردہ نہیں ہوئے۔ ان کی شخصیت سادہ لوحی، منکسر المزاجی، حلاوت، شیریں گفتاری، عجز وانکساری اور مروت سے مزین تھی۔ وہ ایک حساس دل کے مالک تھے۔ وہ اپنے گردوپیش کے ماحول، اپنے زمانہ کے حالات، سماج کے فرسودہ رسم ورواج سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی میں جو کچھ بھی محسوس کیا اس کو بڑے دلکش انداز میں صفحہ قرطاس پر اتار دیا۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کرکے ان کے تدارک کی کوششیں کیں تاکہ ہندوستانی معاشرہ کے افراد ان فرسودہ رسم ورواج کی جکڑبندیوں سے آزاد ہوکر اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے فنکار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی اور نہ ہی کسی دیگر مذاہب کے لوگوں کو حقیر نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہمیشہ سچ کہا اور اسی سچ کہنے کے نتیجے میں ہمیشہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ مالی نقصانات بھی برداشت کرنے پڑے پھر بھی انھوں نے مشکل سے مشکل حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اپنی عاجزی وانکساری کے سبب کبھی حرف شکایت لبوں تک نہ لائے۔ اس سلسلے میں محمد حسام الدین غوری لکھتے ہیں:

> ''منشی پریم چند کی زندگی ابتدا ہی سے عسرت وفلاکت کی گھنگھور گھٹاؤں میں گھری رہی۔ آفتوں کا سامنا ہوا۔ خطرات برداشت کرنے پڑے لیکن انھوں نے تمام آلام وناموافق حالات کا خندہ

پیشانی سے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اپنے آخری لمحات بھی مالی پریشانی وناداری کے عالم میں محض قوم کی بہبودی کی خاطر صرف کیے۔"

(منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، ص:8۷)

پریم چند نے بہت حساس طبیعت پائی تھی۔ گورکھپور کے ڈاکیہ سے پریم چند کو یگانگت ہو گئی تھی اور ڈاکیہ کو بھی پریم چند سے بہت اُنس تھا۔ اس کی محبت کا نقش پریم چند کے دل میں ایسا پڑا کہ ڈاکیہ کی یاد میں ایک کہانی 'قزاقی' لکھ ڈالی۔ اس میں ڈاکیہ کے کردار کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اتفاق سے ڈاکیہ کو کسی وجہ سے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا، جس کی وجہ سے پریم چند کو بہت تکلیف ہوئی اور وہ رات بھر سو نہ سکے۔ صبح ہوتے ہی پریم چند اپنے گھر سے آٹا اور دال لے کر اس ڈاکیہ کو دے آئے۔ اس واقعہ سے پریم چند کی انسانیت نوازی کا اندازہ ہوتا ہے۔

2.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- پریم چند کا جنم 31/ جولائی 1880ء میں بنارس سے تقریباً چار پانچ میل کے فاصلے پر آباد ایک نہایت ہی پسماندہ اور غیر معروف گاؤں لمہی میں ہوا تھا۔
- پریم چند نے ایک ایسے پُر آشوب دور میں آنکھیں کھولیں، جہاں انگریزوں کا تسلط تھا۔ ہندوستان کی سیاسی، معاشی، اقتصادی، علمی اور تہذیبی حالت دگرگوں تھی۔
- پریم چند کی ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی میں ہوئی۔ وہ بہت ذہین تھے لیکن پڑھنے کے بجائے کھیل کود میں انھیں زیادہ دلچسپی تھی۔ گلی ڈنڈا، پتنگ اڑانا اور کھیتوں سے گنے لاکر اسے چوستے رہنے میں انھیں مزہ آتا تھا۔ وہ پڑھنے کے بجائے وہ سارا وقت کھیتوں کے سیر سپاٹے میں گزارتے اور کئی کئی دن مکتب سے غیر حاضر رہتے۔
- والد کی وفات کے بعد گھر کے اخراجات کی ذمہ داری پریم چند کے سر آن پڑی، چنانچہ انھوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھا کر گھر کے اخراجات پورے کیے۔ یہیں سے ان کی باقاعدہ اور سنجیدہ تعلیم کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ اس درمیان انھوں نے میٹرک کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں ساتھ پاس کر لیا۔
- شادی کے بعد گھر اور تعلیم کے اخراجات سے پریشان ہو کر پریم چند کو ملازمت کرنے کا خیال آیا۔ اس دوران 1899ء کو ان کی ملاقات ایک مشنری اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ہوئی، ان کو اپنے اسکول کے لیے ایک استاد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انھوں نے پریم چند کو استاد کی حیثیت سے اپنے یہاں ملازمت دے دی اور تنخواہ اٹھارہ (18) روپئے ماہوار متعین کی۔
- جب پریم چند تبادلہ ہو کر کانپور آئے تو یہاں ان کا قیام دیانرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کے یہاں رہا۔ اس دوران دونوں میں ایسے تعلقات استوار ہو گئے تھے جو آخری دم تک قائم رہے۔ تصنیف و تالیف کا کام یہاں بہت عروج پر رہا۔

- گویا کانپور نے پریم چند کو پریم چند بنایا۔ کانپور آکر پریم چند نے رسالہ 'زمانہ' میں لکھنا شروع کیا۔ اسی طرح ان کی ادبی و علمی زندگی کا آغاز ہوا۔
- 1934ء میں ایک فلمی کمپنی نے کہانیاں لکھنے کے لیے مدعو کیا اور نو ہزار مشاہرہ دینا طے کیا۔ پریم چند نے محسوس کیا کہ اپنے خیالات و نظریات عوام تک پہنچانے کا یہ ایک اچھا پلیٹ فارم ہے۔ اس کے علاوہ آمدنی بھی معقول تھی، جس سے ہنس اور جاگرن میں ہونے والے نقصان کی تلافی بھی کی جاسکتی تھی، لہٰذا وہ بمبئی آگئے۔ یہاں انھوں نے پہلی کہانی 'مل مزدور' لکھی۔
- پریم چند فلمی دنیا سے نالاں ہو کر مئی 1935ء میں بنارس واپس چلے گئے۔ بمبئی کے دورانِ قیام سے ہی ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی، بنارس واپسی پر بھی ان کی صحت میں کوئی درستگی نہ آئی۔ بیماری کے ابتدائی مراحل ہی میں گورکی کے انتقال کی خبر سنی۔ اس سے پریم چند بہت متاثر ہوئے اور بیماری کے باوجود جانے کے لیے تیار ہوگئے لیکن واپسی میں طبیعت نڈھال ہوگئی۔ بالآخر 8/ اکتوبر 1936ء صبح ساڑھے بجے اردو زبان وادب کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

2.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
تسلط	:	غلبہ، حکومت، زور، قبضہ
عسرت	:	تنگدستی
لافانی	:	جو فنا نہ ہو، باقی رہنے والا، دائمی، ابدی
منکسر المزاج	:	غریب مزاج، مسکین طبیعت والا، خاکسار
نظم و نسق انتظام	:	تشکیل نو نیا نیا قائم ہونے والا، جو حال ہی میں بنا ہو
سامراجی شاہی	:	موروثی باپ دادا کا، آبائی، نسلی
طول	:	لمبا
تلخ	:	کڑوا
تلافی	:	کسی نقصان یا کمی کا بدل
مدعو	:	دعوت دینا، بلانا
مضمحل	:	تھکا ہوا، سست، پژمردہ
درخشاں	:	چمکتا ہوا، روشن
صلح کن	:	جو شخص جھگڑے فساد سے دور رہے
سادہ لوحی	:	بھولا بھالا، سادہ دلی، سادہ مزاجی

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ پریم چند کس گاؤں میں پیدا ہوئے؟

(a) بنارس (b) سلطانپور (c) الٰہ آباد (d) لمہی

2۔ پریم چند کی تاریخ ولادت کیا ہے؟

(a) 1880 (b) 1881 (c) 1883 (d) 1882

3۔ پریم چند کی والدہ کا نام بتایئے۔

(a) نندی (b) آنندی دیوی (c) شکنتلادیوی (d) روپادیوی

4۔ پریم چند کو ابتدائی تعلیم میں کون کون سی زبانوں کی تعلیم دی گئی؟

(a) اردو-عربی (b) اردو-ہندی (c) عربی-سنسکرت (d) اردو-فارسی

5۔ پریم چند نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کس رسالہ سے کیا؟

(a) قومی آواز (b) مریادا (c) زمانہ (d) جاگرن

6۔ فلمی دنیا کے لیے پریم چند نے کون سی کہانی لکھی؟

(a) شعلے (b) کلیاں (c) پھول (d) مل مزدور

7۔ پریم چند نے کس نام سے پریس قائم کیا؟

(a) مریادا (b) سمّان (c) سرسوتی (d) نول کشور

8۔ پریم چند کو فلمی کہانیاں لکھنے کی غرض سے کس سن میں بمبئی گئے؟

(a) 1933 (b) 1934 (c) 1935 (d) 1931

9۔ پریم چند نے کتنی شادیاں کیں؟

(a) دو (b) ایک (c) چار (d) تین

10۔ پریم چند کی تاریخ وفات کیا ہے؟

(a) 1937 (b) 1936 (c) 1938 (d) 1938

2.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1- پریم چند کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟

2- پریم چند نے ملازمت کی غرض سے کن کن شہروں میں قیام کیا؟

3- رسالہ 'ہنس' کے اجرا پر ایک نوٹ لکھیے۔

4- پریم چند کے آخری ایام کس طرح بسر ہوئے؟

5- 'ہنس' کے علاوہ پریم چند نے کن کن رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیے؟

2.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ پریم چند کے معاشی اور خانگی اور ازدواجی حالات بیان کیجیے۔

2۔ پریم چند کی شخصیت پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ پریم چند کی صحافتی خدمات بیان کرتے ہوئے 'ہنس' کے اجرا کے مقاصد بیان کیجیے۔

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے — ڈاکٹر قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1983ء

2۔ پریم چند گھر میں — شورانی دیوی، مترجم: سید حسن منظر، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، 2007

3۔ پریم چند: حیات و فن — اصغر علی انجینئر، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی، 1981ء

4۔ پریم چند: کہانی کار ہنما — جعفر رضا، رام نرائن لال بنی مادھو، الہ آباد، 1969ء

5۔ توقیت پریم چند — مانک ٹالا، مکتبہ جدید، دہلی، 2002ء

2.5.1 کے جوابات:

D-1	A-2	B-3	D-4	C-5
D-6	C-7	B-8	A-9	B-10

اکائی 3: منشی پریم چند کے ادبی معاصرین

اکائی کے اجزا

3.0		تمہید
3.1		مقاصد
3.2		منشی پریم چند کے ادبی معاصرین
	3.2.1	راشد الخیری
	3.2.2	سجاد حیدر یلدرم
	3.2.3	سلطان حیدر جوش
	3.2.4	علی عباس حسینی
	3.2.5	اعظم کریوی
	3.2.6	سدرشن
3.3		اکتسابی نتائج
3.4		کلیدی الفاظ
3.5		نمونہ امتحانی سوالات
	3.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	3.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	3.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
3.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

اردو میں مختصر افسانہ کی تاریخ لگ بھگ ایک صدی پرانی ہے۔ باوجود اس کے اس میں اتنا متنوع اضافہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو افسانے کا پہلا دور پہلی جنگ عظیم تک پھیلا ہوا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں شکست وریخت، قتل وغارت گری، اضطراب وانتشار کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس کا اثر لازمی طور پر ادب پر ہونا تھا۔ جن کی ترجمانی ہمارے ادیبوں

بالخصوص دبستان پریم چند اور دبستان یلدرم کے مصنفین و افسانہ نگاروں نے کی ہے۔ جن میں پریم چند اور سید سجاد حیدر یلدرم کے علاوہ علامہ راشد الخیری، نیاز فتح پوری، علی عباس حسینی، سدرشن، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، اعظم کریوی اور عظیم بیگ چغتائی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اس اکائی میں ہم پریم چند کے منتخب ادبی معاصرین کے اجمالی حالات زندگی اور ادبی کارناموں کا جائزہ لیں گے۔ جن کا شمار اردو افسانہ نگاری کے پہلے اور دوسرے دور کے اہم مصنفین میں ہوتا ہے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- پریم چند کے ادبی معاصرین کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- پریم چند کے معاصرین کی ادبی خدمات سے اجمالی طور پر واقفیت حاصل کر سکیں۔
- پریم چند کے ادبی معاصرین کی تصنیفات کی روشنی میں اس دور کے حالات سے باخبر ہو سکیں۔
- رومانی طرز تحریر کے افسانہ نگاروں خصوصا "سجاد حیدر یلدرم کے افکار و نظریات سے واقف ہو سکیں۔

3.2 منشی پریم چند کے ادبی معاصرین

پریم چند نے جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت کا سماج بڑی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ہندوستانی تہذیب زوال پذیر ہو رہی تھی تو ایک نئی تہذیب جسے ہم مغربی تہذیب کہتے ہیں اپنے اثرات ہندوستانی قوم پر مرتب کر رہی تھی۔ بیسویں صدی ابتدا ہی سے بڑی ہنگامہ پرور رہی ہے۔ علم و ادب، معاشرت و صنعت و حرفت ہر لحاظ سے ایک انقلاب برپا ہوا ہے۔ جمہوریت اور وطنیت کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب اردو میں افسانہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس کا پہلا دور 1903 سے 1914 کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دور کے اہم افسانہ نگاروں میں منشی پریم، سجاد حیدر یلدرم، علامہ راشد الخیری، سلطان حیدر جوش ہیں۔ اس دور کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے افسانہ نگاروں کا مطمح نظر معاشرے کی اصلاح تھا۔ لہٰذا ہر ایک نے اپنے لیے ایک الگ راستہ منتخب کیا۔

3.2.1 راشد الخیری

علامہ راشد الخیری کا اصل نام محمد عبد الراشد تھا مگر علمی دنیا میں راشد الخیری کے نام سے مشہور ہوئے۔ راشد الخیری کے دادا مولوی عبد القادر کا شمار قران و حدیث کے ماہر جید علماء میں ہوتا تھا۔ جن کا سلسلہ نسب رسول اکرمؐ کے صحابہ عکرمہ بن ابو جہل سے ملتا ہے۔ علامہ کے والد حافظ عبد الواحد بھی دینی علوم کے ساتھ انگریزی میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو منصف مقرر ہوئے۔ انہوں نے کوٹ پتلون پہنی اور مغربی معاشرت بھی اختیار کی۔ لیکن راشد الخیری کی تربیت دادا نے خالص اسلامی اور مشرقی طریقے پر کی۔ قرآن شریف اپنی دادی سے اور ابتدائی تعلیم دادا سے حاصل کر کے دلی کے عربی اسکول میں داخل ہوئے۔ انگریزی مضمون میں دلچسپی رہی اور

ہمیشہ جماعت میں اول رہے۔

دلی عربک اسکول کے اساتذہ میں خواجہ شہاب الدین ہیڈ ماسٹر، انگریزی کے استاد مرزا احمد بیگ اور مولانا الطاف حسین حالی اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ مگر حالات معقول نہ ہونے کی وجہ سے نویں جماعت میں تھے کہ اسکول جانا چھوڑ دیا۔ پھر گھر پر رہ کر آگے کی پڑھائی اپنے پھوپھا مولوی نذیر احمد کی نگرانی میں مکمل کی۔ بچپن سے سیر و تفریح کا شوق تھا۔ موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ نذیر احمد نے اس انداز میں تربیت کی کہ کبھی کوئی کتاب دے کر کہتے اس کو پڑھ کر سناؤ۔ یا کوئی کتاب دیتے اور کہتے کل مطالعہ کر کے آنا۔ دوسرے دن اسی کتاب سے جگہ جگہ سے سوال کرتے۔ راشد الخیری اگر مطالعہ کر کے آتے تو صحیح صحیح جواب دیتے ورنہ الٹا سیدھا جواب دیتے۔ دھیرے دھیرے صحیح جواب دینے لگے تو نذیر احمد نے مضمون لکھنے کی عادت ڈالی اور خود اصلاح کرتے۔

راشد الخیری کو محکمہ بندوبست اناؤ میں 1891ء میں کلرک کی حیثیت سے نوکری ملی مگر دفتری کاموں میں ان کا دل نہ لگتا تھا۔ اناؤ سے مین پوری، علی گڑھ اور دہرہ دون تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر میں دلّی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبادلہ ہوا مگر چند سال کے بعد ہی 1910ء میں انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مکمل طور پر تصنیف و تالیف اور مختلف رسالوں کی مدیریت کے فرائض انجام دینے لگے۔ آخر کار 3 فروری 1936 کو اس علمی و ادبی شخصیت کا دہلی میں انتقال ہوا۔ مختلف اخبارات اور قومی و ملی اداروں اور شخصیات نے ان کا غم منایا اور خراج عقیدت پیش کیا۔

راشد الخیری میں ادبی ذوق اپنے پھوپھی زاد بھائی اشرف حسین کی صحبت سے ہوا۔ مولانا حالیؔ اور نذیر احمد کی شاگردی نے مزید جلا بخشی۔ انہوں نے دوران تعلیم ہی مضامین لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی پہلی تصنیف "احسن و میمونہ" ایک عشقیہ ناول تھی جو 1894ء میں بریلی سے "روہیل کھنڈ گزٹ" میں ہفتہ وار شائع ہوتی رہی۔ جب اس ناول کا ایک حصہ مکمل ہو گیا تو ڈپٹی نذیر احمد کو اس امید کے ساتھ دکھایا کہ داد ملے گی۔ انہوں نے بجائے داد دینے کے یہ کہا کہ غیروں کی تقلید کر کے اس وطن کو بدنام کرتے ہو جس کی خاک نے کیسے کیسے لعل و گہر پیدا کیے ہیں۔ چنانچہ راشد الخیری نے نذیر احمد کی تصانیف "مراۃ العروس" اور "توبتہ النصوح" کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد "صالحات" نامی ناول لکھا جو 1896 میں مکمل ہوا۔ یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو شائع ہوئی۔ 1897ء میں اپنی شاہکار تصنیف "منازل السائرہ" لکھی اور اسی ناول کی وجہ سے انہیں اردو میں چارلس ڈکنز کے نام سے یاد کیا گیا۔

ان دونوں اصلاحی ناولوں کے بعد راشد الخیری کی شہرت ایک بلند پایہ مصنف کے طور پر ہونے لگی۔ 1903ء سے ان کے افسانے اور مضامین رسالہ "مخزن" لاہور میں شائع ہونے لگے۔ 1903ء ہی میں راشد الخیری کا طویل افسانہ "نصیر اور خدیجہ" جسے بعض محققین نے اردو کا پہلا افسانہ شمار کیا ہے اسی رسالے میں شائع ہوا۔

راشد الخیری کو مصورِ غم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں مظلوم طبقے کے مسائل کو موضوع بنایا۔ عورتوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس میں وہ نذیر احمد کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر ان کا طریقہ اصلاح نذیر احمد سے بالکل مختلف ہے۔ نذیر احمد کے یہاں نصیحت کا پہلو واضح نظر آتا ہے مگر راشد الخیری نے برائیوں کو واضح کرنے میں زیادہ دھیان دیا ہے۔ انہوں نے معاشرے کی برائیوں کو اصلاح کی غرض سے زیادہ اجاگر کرنا چاہا۔

انہوں نے اپنے ناول "صبح زندگی" میں عورتوں کی تربیت کے متعلق ترتیب سے عنوان قائم کیے ہیں۔ سلائی، کٹائی، لباس پہ کڑھائی کے مختلف ٹانکے نمونوں کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ باقاعدہ ان کی شکلیں بھی بنائی ہیں۔ اسی طرح جب وہ کھانے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے بنانے کا طریقہ اور اجزا کی ترکیب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر ان تمام باتوں کو ناول سے نکال دیا جائے تو الگ سے امور خانہ داری پہ ایک کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔

راشد الخیری واقعات کو بیان کرنے میں تفصیل سے کام لیتے ہیں لیکن جب کیفیات کو بیان کرتے ہیں تو سبک روی سے گزر جاتے ہیں جس سے قاری کی اس سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

"طوفان حیات" راشد الخیری کا ایسا ناول ہے جسے مکمل ناول کہا جاسکتا ہے۔ جس میں ایک نوجوان کی کہانی بیان کی ہے جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بے حد نمازی، شریعت کا پابند تھا۔ جس کی واجب نماز کیا تہجد بھی کبھی قضا نہ ہوتی تھی لیکن بیوی رسومات میں جکڑی ہوئی، پیری مریدی کی پرستار، تعویذ گنڈوں کی شیدائی ملی۔ جس کے نتیجے میں آدھی سے زیادہ جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پوری کہانی توہم پرستی، پیر پرستی اور غلط رسم ورواج کے ارد گرد گھومتی ہے۔ راشد الخیری نے بڑے مصلحانہ انداز میں ان بدعقیدگی کے ناسوروں پر نشتر چلایا ہے۔ ناول "طوفان حیات" اگرچہ ایک اصلاحی ناول ہے لیکن اس کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے جس میں قاری کی ابتدا سے انتہا تک دلچسپی باقی رہتی ہے۔

راشد الخیری ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کا پہلا افسانہ "نصیر اور خدیجہ" مخزن لاہور میں 1903ء میں شائع ہوا۔ جو ایک خط کی صورت میں ہے۔ راشد الخیری نے خاص طور سے اپنے افسانوں کا موضوع مسلمان گھرانوں کی خواتین اور ان کے مسائل، اصلاح معاشرت، تعلیم وتربیت، اصول خانہ داری، طلاق کے مسائل، جہیز، بے معنی رسم ورواج، بدعقیدگی اور توہمات کو بنایا ہے۔

"قطرات اشک" راشد الخیری کے ابتدائی افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں 13 افسانے شامل ہیں۔ جن میں "بدنصیب کا لال"، "ماہ جبین اندرا"، "سارس کی تارک الوطنی"، "رویائے مقصود"، "مظلوم کی فریاد"، "چاندنی چوک کا جنازہ" "ایک مظلوم بیوی کا خط" بہت مشہور ہوئے۔ اس کے علاوہ راشد الخیری کے افسانوی مجموعوں میں "حور اور انسان(1915)، سات روحوں کے اعمال نامے (1917)، گوہر مقصود(1918)، جوہر عصمت(1920)، گلدستہ عید(1927)، سیلاب اشک(1928)، قلب حزیں(1928) طوفان اشک(1929)، شہید مغرب(1929)، ،نسوانی زندگی(1931)، بیلہ میں میلہ، غدر کی ماری شہزادیاں (1932) گرداب حیات(1936)، مسلی ہوئی پتیاں(1937)، بساط حیات(1937)، خدائی راج(1938) قابل ذکر ہیں۔

3.2.2 سجاد حیدر یلدرم

رومانوی تحریک کے زیر اثر افسانہ لکھنے والوں میں ایک اہم نام سید سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔ اردو افسانے کے حوالے سے سید سجاد حیدر یلدرم کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف مغربی ادب کا اردو میں ترجمہ کیا بلکہ مستقل طور پر رومانی طرز فکر کو اپنا کر اپنے نئے

دبستان کی بنیاد رکھی جسے ہم رومانی تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم نہٹور ضلع بجنور میں 1880ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو علم و فضل میں بے مثال تھا۔ یلدرم کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید بن امام زین العابدین علیہ السلام سے جاملتا ہے۔ ایذا رسانی سے بچنے کے لیے ان کے اجداد نے شہر ترمذ میں پناہ لی اور وہاں سے 1180ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ سجاد حیدر یلدرم کے جد امجد سید کمال الدین ترمذی کا شمار اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صوفی کے طور پر ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی تبلیغ کا دائرہ موجودہ ہریانہ کے علاقہ کو بنایا اور ہزاروں لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔

سجاد حیدر یلدرم جب پیدا ہوئے تو آپ کے والد سید جلال الدین حیدر جھانسی ضلع میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز تھے۔ شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر جمیل اختر نے یلدرم کی جائے پیدائش جھانسی لکھا ہے۔ اس کے بعد ان کے والد کا تبادلہ بنارس ہو گیا لہٰذا یلدرم کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ 1892ء میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں نویں جماعت میں داخل کیے گئے اور اسی کالج سے 1901ء میں بی۔ اے کی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال بغداد میں برطانوی قونصل خانے میں ترکی کے ترجمان (مترجم) کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ کئی سال بغداد میں گزارے۔ اس کے علاوہ انڈمان و نکوبار اور مختلف جگہوں پر خدمات انجام دی۔ 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے رجسٹرار بنائے گئے اور تقریباً 8 سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ پھر علالت کی وجہ سے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لیا اور زندگی کے آخری ایام لکھنؤ میں گزارے اور وہیں 1943ء میں انتقال ہوا۔ عیش باغ کے قبرستان میں سپرد لحد ہوئے۔

سجاد حیدر یلدرم کی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ یلدرم ذہین اور ہونہار تو تھے ہی پھر علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا نے ان کے شوق کو اور پروان چڑھایا۔ ابھی بی۔ اے مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ ان کے مضامین پانیئر میں شائع ہونے لگے تھے۔ اس کے علاوہ 1896 سے 1899 تک "معارف" کے معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی۔

ترکی زبان میں دلچسپی کی بنا پر دوران طالب علمی ہی اس زبان پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ جب بغداد میں مقیم تھے تو ترکی ادب کی طرف توجہ دی۔ ترکی افسانوں نے سجاد حیدر یلدرم کو کافی متاثر کیا۔ انہوں نے ترکی کے اہم ادیب احمد حکمت کے ایک اہم ناول "ثالث باالخیر" کا 1902ء میں اردو میں ترجمہ کیا۔ جس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> "میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گا بلکہ ترکوں کی سوشیل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آجائے گا۔ ترکوں کی سوشیل زندگی کی تصویر میں اردو میں اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آرہا ہے وہ انہیں بھی پیش آچکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہو گا۔ مگر ترکوں کا طرز ادا مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرز تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں لفظی ترجمہ کی کوشش کی ہے۔ گفتگو تو انوکھی ہے لیکن سنئے تو سہی؛ ع

غریب شہر سخن ہائے گفتگو دارد:

(ماہنامہ پگڈنڈی، امرتسر، سجاد حیدر یلدرم نمبر، ص36)

اردو افسانے کی ابتدا انگریزی، فرانسیسی اور ترکی افسانوں کے تراجم سے ہوئی۔ مغربی ادب کے اثرات یوں تو دلی کالج کے زمانے سے ہی اردو ادب پر پڑنے لگے تھے اور علیگڑھ تحریک نے اس روایت کو مزید جلا بخشی۔ لہٰذا بیسویں صدی کی ابتدا میں جن ادیبوں کی نسل تیار ہوئی وہ لوگ مغربی زبان وادب سے واقفیت رکھتے تھے جس کے نتیجے میں تراجم کا دور شروع ہوا۔

سجاد حیدر یلدرم اپنے عہد کا گہرا سماجی و سیاسی شعور رکھتے تھے۔ وہ اپنی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے جدید علوم و نظریات سے استفادہ کی حمایت کرتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر رومانی ہے۔ ان کے افسانوں میں محبت کے نغمے، زبان کی لطافت اور رومان پرور فضا نظر آتی ہے۔ انہوں نے ترکی ادب سے براہ راست اثر قبول کیا۔ پہلی مرتبہ انہوں نے انسان کی بنیادی اور جبلّی ضرورتوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔

سجاد حیدر یلدرم کا مشہور افسانہ "خارستان وگلستان" جون1906ء میں رسالہ مخزن لاہور میں چھپا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ شیخ عبدالقادر اس افسانے کی ابتدا میں سید سجاد حیدر یلدرم کے متعلق لکھتے ہیں:

> "سید سجاد حیدر یلدرم کی طرز تحریر میں جو بات ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے وہ اس کی جدّت اور اچھوتا پن ہے۔ جب کبھی وہ کچھ لکھتے ہیں نثر ہو نظم، اس میں ایک انداز خاص ہوتا ہے جس کا لطف جاننے والے جانتے ہیں۔ مگر یہ محبت والفت کا فسانہ جس کی تلخیص کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔ ان کی روش کے اعتبار سے بھی نرالے ڈھنگ کا ہے۔ تخیل کا جو کمال اس میں دکھایا گیا ہے بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔" سید صاحب کی یہ کمال عنایت ہے کہ اسے علیٰحدہ کتاب کی صورت میں شائع کرانے سے پہلے مخزن میں چھپ جانے کی اجازت دی ہے۔ اس افسانے کے تین باب ہیں۔ گلستان، خارستان اور شیرازہ۔"
>
> (مخزن، شیخ عبدالقادر، جون1906، ص1)

"خیالستان" سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو 1911ء میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے ادب برائے ادب کے نظریے کو سامنے رکھ کر سارے افسانے لکھے۔ ان افسانوں میں دلکش اور منفرد تشبیہات، رومانی فضا اور سچّے جذبات کی نمائندگی پائی جاتی ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں "خارستان و گلستان، نکاح ثانی، سودائے سنگین، حکایت لیلیٰ مجنوں، مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، چڑیا چڑے کی کہانی" جیسے مشہور افسانے شامل ہیں۔

اسی طرح ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "حکایات واحتساسات" کے عنوان سے 27-1926ء میں منظر عام پر آیا۔ ان افسانوں میں یلدرم نے جن رومانی نظریات ورویوں کو بیان کیا وہ نہ صرف ان کے زمانے میں بلکہ بعد میں آنے والے ادیبوں نے بھی ان کی تقلید کی جن میں نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوشؔ، حجاب امتیاز علی، لطیف احمد، محمد علی رودولوی، مسز عبدالقادر، مجنوں گورکھپوری اور قاضی عبدالغفار کے

نام شامل ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے تلخ حقائق اور سیاسی نظام کی خرابیوں کے بجائے زندگی کے مثبت پہلوؤں اور پیار و محبت کے جذبے کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے ادب اور زندگی کے رشتے کو تو قبول کیا لیکن ان کا کہنا تھا کہ ادب اور ادیب کو زندگی کے ان جھگڑوں سے بچنا چاہیئے جن میں پھنس کر ادیب کو مصلح اور ادب کو پند و وعظ بننا پڑتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے وہ اپنے افسانوں میں عورت کو دنیا کی سب سے خوبصورت چیز بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس کے وجود کو دنیا کی رونق قرار دیتے ہیں۔ یلدرم کے افسانوں میں عورت کا جو تصور ہے اس کے بارے میں قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

> "یلدرم کی رومانیت خالص مغربی اور ترکی رومانیت تھی۔ انہوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ چلمن کے پیچھے سے جھانکنے والی سرشار کی سپہر آرانہ تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہمراہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے۔ جو ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انہوں نے اپنے قصوّں کی لڑکیوں کو لکھنؤ اور دلّی کی حویلیوں کی چار دیواری سے نکال کر بمبئی کی چوپاٹی پر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنے کی تمنا کی"
>
> (قرۃ العین حیدر، سجاد حیدر یلدرم نمبر، پگڈنڈی امرت سر، ص36)

نذر سجاد حیدر نے بھی یلدرم کو تحریک آزادی نسواں کا علمبردار مانا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"یلدرم کو تعلیم اور آزادی نسواں کا سودا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ ترکی کے نام پر مرتے تھے"

سجاد حیدر کے یوں تو تمام افسانوں میں رومانیت کی عکاسی ہے لیکن "خارستان و گلستان" میں عورت اور مرد کی زندگی میں ایک دوسرے کی اہمیت اور کشش کو رومانی اور جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان شیریں، تشبیہات و استعارات میں ندرت اور تراکیب کا صحیح استعمال پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا پس منظر انسانی فطرت ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات و مشاہدات کی روشنی میں افسانے لکھے ہیں۔

3.2.3 سلطان حیدر جوشؔ

سیطان حیدر جوش سجاد حیدر یلدرم اور منشی پریم چند کے ہم عصر تھے۔ سلطان حیدر جوش کا وطن بدایوں تھا لیکن وہ 9 نومبر 1886ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کی طرف سے بدایوں کے فریدی خاندان سے تعلق تھا جن کا سلسلہ بابا فرید گنج شکر سے جاملتا ہے۔ والدہ کا تعلق دہلی کے ایک معزز خاندان حکیم احسن اللہ دہلوی سے تھا۔ بچپن دہلی میں گزرا۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹر کا امتحان پاس کیا پھر 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا۔ لیکن 1906ء میں بعض وجوہات کی بنا پر کالج سے نکال دیئے گئے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک عرصہ تک بے روزگار رہے بالآخر اپنے چچا کی سفارش پر نائب تحصیلدار کے عہدے پر ملازمت اختیار کی اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر پہنچ کر ریٹائرڈ ہوئے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد مستقل طور پر علی گڑھ رہائش اختیار کی اور یہیں 1953ء میں وفات پائی۔

سلطان حیدر جوش کی افسانہ نگاری کی شروعات 1904ء میں ہوئی۔ان کا پہلا افسانہ "نابینا بیوی" کے عنوان سے رسالہ "مخزن" دسمبر 1907ء میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ "تمدن" دہلی میں بھی بہت سے مضامین چھپے۔ ان کے افسانے رسالہ "مخزن، تمدن، الناظر، زمانہ، نقیب، کہکشاں، ہمایوں، نیرنگ، ساقی، سہیل اور نیرنگ خیال کے مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے۔انہیں جن افسانوں سے زیادہ شہرت ملی، ان میں "جذبہ کور (ساقی، جولائی 1930) "جذبہ تیز (نیرنگ، اپریل 1931) "گناہ بے گناہی (نیرنگ خیال، 1935ء) مادرزاد (سہیل، جنوری 1936) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں میں "فسانہ جوش" اور "جوش فکر "ہیں۔ جن میں کل افسانوں کی تعداد دس ہے۔اس کے علاوہ پندرہ علمی و ادبی مضامین بھی انہیں مجموعوں میں شامل ہیں۔

پہلے افسانوی مجموعے "فسانہ جوش" میں انہوں نے مغربی تہذیب کا تاریک پہلو دکھانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے اس مجموعے میں ایسے حادثات وواقعات کا بیان کیا ہے جس میں مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں کا انجام نہایت عبرت ناک اور برا ہوتا ہے۔ایسے ہی عبرت ناک واقعات سے انہوں نے اپنے افسانے کے پلاٹ تیار کیے ہیں۔انہوں نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔اس میں مقصدیت غالب ہے۔اگر وہ درمیان میں طنز ومزاح کا سہارا نہ لیتے تو خشک وعظ اور غیر دلچسپ تقریر کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

سلطان حیدر جوش کا شمار فکری اعتبار سے اصلاحی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے لیکن اسلوب اور انداز بیان کے لحاظ سے ان کا تعلق رومانی دبستان سے ہے۔ان کے افسانوں میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے اثرات بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ مگر فکر وفن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جھکاؤ یلدرم کی طرف زیادہ ہے۔ان کے بعض افسانوں میں سجاد حیدر یلدرم کی جھلک نظر آتی ہے۔یلدرم کے افسانے "خارستان وگلستان" میں رومانیت اور رنگینی پائی جاتی ہے وہی ان کے افسانے "پہلا گناہ" میں بھی دیکھی جاسکتی ہے:

> "ایک روز سہانی صبح تھی۔چاند اپنا منھ دیکھ رہا تھا۔ستاروں کا منھ فق ہوگیا تھا۔سورج کی آمد آمد تھی۔تمام میں شادیانے بج رہے تھے۔چوپائے کلیلیں کررہے تھے۔ہرن چوکڑیاں بھر رہے تھے۔چڑیا چہچہا رہی تھیں۔پرند گیت گارہے تھے۔ہر طرف ایک نغمہ عریان موجزن تھا۔ایک آبشار کے قریب طرح طرح کے خوشنما پھول کھلکھلا کھلکھلا کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو تمام میں پھیلی ہوئی تھی۔پتّے تالیاں بجارہے تھے۔ نسیم پھولوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کررہی تھی۔۔۔۔"

(فسانہ جوش، سلطان حیدر جوش، افسانہ پہلا گناہ، ص6، 205)

سلطان حیدر جوش کے اسلوب کی رنگینی اور واقعات کو بیان کرنے کی چاشنی انہیں رومانی افسانہ نگاروں کی فہرست میں لا کھڑا کرتی ہے۔ان کا ایک اور افسانہ "نرگس خود پرست" بھی رومانی انداز میں لکھا ہوا ہے جس میں نرگس اور صدا کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔انداز بیان رومانویت لیے ہوئے ہے۔مناظر فطرت کی بھی بہترین عکاسی کی ہے۔

ان کے افسانوں میں طنز ومزاح کے پہلو بھی ملتے ہیں۔افسانہ "مساوات" ڈرامائیت اور جذباتی تصادم کا حامل افسانہ ہے۔اس

افسانے میں مغرب پرستی اور فیشن پرستی دونوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ وہ برصغیر کی معاشرتی زندگی کے پہلوؤں کے بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ انہوں نے سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کے ذریعہ اجاگر کیا۔ سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور رومانیت پسندی کے عناصر بیک وقت نظر آتے ہیں۔

3.2.4 علی عباس حسینی

پریم چند کے مقلدین اور ہم عصر ادیبوں میں ایک نام علی عباس حسینی کا ہے۔ انہوں نے پریم چند کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ علی عباس حسینی 3 فروری 1897ء کو موضع پارہ ضلع غازی پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد صالح تھا۔ عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سے اور انگریزی تعلیم الہ آباد اور لکھنؤ میں رہ کر حاصل کی۔ اس کے بعد رائے بریلی کے گورنمنٹ اسکول میں انگریزی اور تاریخ کے استاد مقرر ہوئے۔ ایک مدت تک حسین آباد انٹر کالج کے استاد اور پرنسپل کی خدمات دیتے ہوئے 30 جون 1954ء میں لکھنؤ کے حسین آباد انٹر کالج سے بحیثیت پرنسپل سبکدوش ہوئے اور لکھنؤ ہی میں سکونت اختیار کی۔ 27 ستمبر 1969ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

علی عباس حسینی کا شمار اردو کے افسانہ نگاروں میں اہم اس وجہ سے بھی ہے کہ انہوں نے اپنے دور کی تمام ادبی تحریکوں و رجحانات کے اثرات قبول کیے۔ حقیقت، رومانیت اور مقصدیت سے تاثیر لیتے ہوئے فن افسانہ نگاری میں ایک منفرد راہ نکالی جس سے اردو کی افسانہ نگاری کی روایت میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہات کے مسائل، دکھ درد، دیہاتیوں کے جذبات و احساسات اور ان کی نفسیات کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے درج ذیل عنوانات کے تحت ہیں۔

(1) رفیق تنہائی (2) میلہ گھومنی (3) باسی پھول (4) آئی۔ سی۔ ایس
(5) ایک حمام میں (6) ہمارا گاؤں (7) کچھ ہی نہیں ہے (8) سیلاب کی راتیں
(9) ندیا کنارے (10) کانٹوں میں پھول

علی عباس حسینی نے اپنے بیشتر افسانوں خاص طور سے "رفیق تنہائی"، آئی۔ سی۔ ایس "میلہ گھومنی" "کچھ نہیں" "الجھے دھاگے" "ہمارا گاؤں میں دیہاتی زندگی، وہاں کے رہنے والوں کا بھولا پن، ان کا خلوص وایثار کی ترجمانی کی ہے۔ ان افسانوں میں دیہاتی مسائل کے ساتھ جو چیز قابل توجہ ہے وہ ہے ان کی فطرت نگاری۔ جسے انہوں نے بہت ہی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانے "جذبِ کامل" میں رومان اور زندگی کی ہم آہنگی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "نینی تال کے ایک بنگلہ نما مکان کے کوٹھے پر کملا کھڑی تھی اور شاخِ صندل سا ایک ہاتھ بڑھائے صدفِ کف میں پھہاروں کے موتی جمع کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے ساڑی کا وہ نچلا حصہ دبائے ہوئے تھی۔ جسے پہاڑ کی سرد ہواؤں کے جھونکے شوخی اور بے باکی سے اس کے فرائض کی انجام دہی سے باز رکھتے تھے۔ اور بار بار بلورین پنڈلیوں کو بے نقاب کیے دیتے

تھے۔ساتھ ہی ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ سے چھٹکی ہوئی زلفوں کے بال اکثر جھنجھلا کر اس کے کان تک ہوا کی بے ادبی کی شکایت کرنے آتے اور گردن ورخ پر غصہ میں بل کھا کھا کر مچلنے لگتے تھے۔"

(افسانہ "جذب کامل، از رفیق تنہائی، علی عباس حسینی، ص25)

علی عباس حسینی کا اسلوب رومانیت لیے ہوئے ہے۔وہ زندگی کے مسائل کو بڑی دردمندی اور فنی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں فن مقصد پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانوں کا اختتام عام طور پر المیہ پر ہوتا ہے۔لیکن یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ جس طرح احساس کرتے ہیں اور جو کچھ سوچتے ہیں وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ قاری تک پہنچاتے ہیں۔ان کے اسلوب میں تصور آفرینی بھی پائی جاتی ہے اور دردمندی کا جذبہ بھی۔

علی عباس حسینی ایک رومانی انقلاب کے داعی تھے۔ان کے افسانوں میں سرسبز وشاداب کھیت، پانی سے چھلکتے تالاب اور بہتے نالوں کی غمازی ملتی ہے۔سید وقار عظیم ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پریم چند نے ساری زندگی دیہات کی زندگی پر افسانے لکھے پھر بھی دیہات کی رنگین زندگی کی ساری باتیں نہ کہہ سکے۔اس کمی کو علی عباس حسینی نے پورا کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔"

(نیا افسانہ، سید وقار عظیم، ص25)

علی عباس حسینی نے اپنے وسیع مطالعے، داستان گوئی اور فنی بصیرت کی بنا پر اردو افسانہ نگاری میں اپنے لیے نیا راستہ پیدا کیا اور اپنے معاصرین اور آئندہ کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم افسانہ نگار کے طور پر متعارف ہوئے۔

3.2.5 اعظم کریوی

پریم چند کے نظریات کو آگے بڑھانے والوں میں ایک نام اعظم کریوی کا بھی ہے۔ان کا تعلق دبستان پریم چند سے ہے۔انہوں نے دیہات کی منظر نگاری کو زبان وبیان کی رنگینی، جذبات نگاری اور تخیل آفرینی سے اس انداز سے پیش کیا کہ وہ رومان کے قریب معلوم ہوتی ہے۔اعظم کریوی 1898ء میں الہ آباد کے کورئی گاؤں پرگنہ چائل میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام انصار احمد اور والد کا نام فیاض احمد تھا۔ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے الہ آباد آئے اور انٹر کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد فوج میں داخل ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔وہاں سرکاری ملازم ہوئے لیکن شعر وشاعری کرتے رہے اور افسانہ نگاری کا سلسلہ بھی منقطع نہیں کیا۔اعظم کریوی کو طب اور صحافت سے شغف تھا۔اچھے مترجم بھی تھے۔بالآخر 1955 میں قتل کر دیئے گئے۔

اعظم کریوی کے تمام افسانوں میں دیہاتی زندگی کے نقوش پائے جاتے ہیں۔ان کے افسانوں کی امتیازی خصوصیات یہ ہے کہ وہ پریم چند کی طرح دیہاتی معاشرت کے تمام پہلوؤں کو تفصیل سے بیان نہیں کرتے بلکہ چند اثر انگیز واقعات کے ذریعہ اپنے افسانوں کا پلاٹ

تیار کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت کا ایک سبب ان کی زبان بھی ہے۔ انہوں نے فارسی اور ہندی زبانوں کے درمیان سے ایک ایسے لہجے کی دریافت کی جو دیہاتی ماحول سے قریب تھا۔

اعظم کریوی کے افسانوی مجموعوں میں "پریم کی چوڑیاں، دکھ سکھ، شیخ وبرہمن، انقلاب اور دوسرے افسانے، کنول اور دوسرے افسانے، روپ سنگھار، دل کی باتیں" شامل ہیں۔ ان کا تعلق دبستان پریم چند کے افسانہ نگاروں میں سے ہے اگرچہ ان کے افسانوں میں دیہات کا رومانی تصور بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہات کے موسم، مناظر فطرت، رہن سہن اور رسم ورواج کو بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "خدا خدا کر کے گرمیوں کی چھٹیوں میں پورے ایک سال کے بعد راما الہ آباد سے واپس ہوا۔ جس وقت وہ گاؤں میں پہنچا دن ڈوب رہا تھا اور بھینسیں چراگاہ سے واپس ہو رہی تھیں۔ سورج دیوتا کی سنہری شعاعوں میں گائیں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گنگا جی میں چمکتے ہوئے تارے۔ گوالے "برہا" گاتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی بہوئیں گھڑے لیے گنگا جی سے پانی بھرنے جارہی تھیں۔ ان میں سے ایک شوخ اور چنچل عورت نے گھونگھٹ کی اوٹ سے راما کو دیکھ کر اپنی ایک سہیلی سے کہا، "اری! دیکھ تو یہ کون کرسٹان کا بچہ آگیا ہے" اس کی سہیلی نے غور سے راما کو دیکھ کر کہا، "یہ تو راما ہے، کیا تو نہیں جانتی یہ ہمارے زمیندار کا لڑکا ہے۔" ارے یہ وہی راما ہے جو دھوتی کرتا پہنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا پھرتا تھا، میں نے بالکل نہیں پہچانا تھا اور پہچانتی کیسے آج تو یہ انگریزی کپڑے پہن کر آیا ہے۔"
>
> (پریم کی چوڑیاں، اعظم کریوی، ص10،9)

اعظم کریوی حقیقت پسند افسانہ نگار ہونے کے باوجود لب ولہجہ کے اعتبار سے رومانی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ حقیقت پسندانہ رجحان کو موثر انداز میں قاری تک پہنچانے کے لیے رومانوی طرز نگارش کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت کا تصور تعمیری اور بامقصد ہے۔ وہ عورت کو ایک بلند مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں ایک حقیقت نگار کے دردمندی کے جذبے کے ساتھ ایک رومانوی ادیب کا احساس جمال بھی جابجا نظر آتا ہے۔ لہٰذا اعظم کریوی کے لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ حقیقت نگاری کے ساتھ اردو افسانہ کو ایک نیا زاویہ عطا کیا۔

فرقہ واریت کے موضوع پر انہوں نے "شیخ وبرہمن" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ہے جس میں دیہات میں رہنے والے ہندو مسلمان گھرانے کی آپس میں دوستی اور تعلقات کو بیان کیا ہے جسے مسلمان مولوی اور ہندو پنڈت درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر دور دور تک مشہور تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں ساتھ دیتے تھے لیکن ان کے مرنے کے بعد دونوں گھروں کے تعلقات استوار رہے۔ پنڈت دیا شنکر کی برسی کے موقع پر شہر سے ایک پرچارک کو بلایا جس نے کتھا کے دوران مسلمانوں کے خلاف بیان دیا

اور سنگھٹن کو مضبوط کرنے پر زور دیا۔ یہی سے دوریاں بڑھنا شروع ہوئی۔ اور آگ میں گھی کا کام مسجد کے ملا جی نے کیا۔

اعظم کریوی نے اپنے افسانوں میں اپنے آبائی وطن کورئی گاؤں ضلع الہ آباد کا تذکرہ بہت ہی محبت اور عقیدت سے کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں بھی وطن کی محبت جاگ جائے۔ انہوں نے اپنے افسانے "پریم کی لیلا، پریم کی چوڑیاں، عبرت، تماشہ، سچی خوشی وغیرہ میں کئی جگہ اپنے گاؤں کا نام لیا ہے۔ پریم کی لیلا افسانہ تو ان کے گاؤں کے نام سے ہی شروع ہوتا ہے:

"کورئی گھاٹ کے پاس گنگا جی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک گاؤں رام چورا ہے۔ بن باس کے زمانے میں سری رام چندر جی یہاں کچھ دن ٹھہرے تھے۔ اس وقت اس گاؤں کا نام رام چورا ہو گیا۔ ایک کٹی اور خوبصورت مندر اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔"

(اعظم کریوی، پریم کی لیلا، ص199)

3.2.6 سدرشن

پنڈت بدری ناتھ سدرشن (1896-1967) پریم چند کے ہم عصر تھے۔ لیکن دونوں کا انداز تحریر جداگانہ تھا۔ سدرشن کا شمار اردو کے ان ابتدائی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف فن کی خدمت کے لیے افسانے لکھے بلکہ معاشرے کی اصلاح، نیکی اور اچھائی کی تلقین اور برائیوں سے بچنے کی بھی اپنے افسانوں کے ذریعے تبلیغ کرتے رہے۔

سدرشن کے افسانوں میں سادگی اور جذبات نگاری کا اچھوتا اسلوب ہے۔ ہندو متوسط طبقوں کی پریشانیوں کو انہوں نے "شاعر، اپنی طرف دیکھ، خانہ داری کا شیوہ، ترک نمود، صدائے جگر خراش، تبدیل قسمت، دو دوست، فریب دوست" میں بہت ہی اچھے انداز میں اجاگر کیا ہے۔ ہندو مت میں جو ذات پات کا تصور قائم تھا وہ اس کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان ذات اور نسل سے اعلیٰ نہیں ہوتا بلکہ عمل اور کردار کی وجہ سے عظمت و عزت کا حامل ہوتا ہے۔

"سدا بہار پھول، بہارستان، چندن، قوس و قزح، سولہ سنگھار، چشم و چراغ اور پھول وتی" ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

سدرشن عام طور سے المیاتی فضا میں افسانہ لکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں انسانی جذبات کے تعلق سے وہ بات کہہ دیتے ہیں جو دل کی گہرائیوں کو چھو لیتے ہیں۔ جیسے افسانے "چندن" کے صفحہ 9 کا یہ فقرہ:

"جس کا دل کڑھ رہا ہو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ایسی خوفناک معلوم ہوتی ہے جیسے شمشان میں چاندنی"

جذبات نگاری کے غیر معمولی بیان کے ساتھ ہی سدرشن نے پریم چند کی طرح متوسط طبقے کی سماجی و معاشی مسائل کی صحیح ترجمانی بھی کی ہے۔ وہ صرف ہندو معاشرے کی عکاسی کرنے میں پریم چند کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ان کا موضوع دیہات کے بجائے شہری زندگی ہوتا ہے۔ ان کے افسانے "گل خارستان، رشوت کا روپیہ، آزمائش، تھوڑا سا جھوٹ" وغیرہ سب میں شہری مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ قومیت کی تحریک سے وابستگی کی بنا پر وہ مغربی تہذیب سے نالاں بھی ہیں۔ سدرشن بنکم بابو سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔

انہوں نے کئی افسانوں میں اس نئی تہذیب کے خلاف بھی لکھا ہے۔ جن میں "تہذیب کے تازیانے" "بنگال بتیسی" مشہور ہیں۔

3.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد درج ذیل باتیں سیکھیں:

- علامہ راشد الخیری کا اصل نام محمد عبد الراشد تھا مگر علمی دنیا میں راشد الخیری کے نام سے مشہور ہوئے۔
- راشد الخیری کی پہلی تصنیف "احسن و میمونہ" ایک عشقیہ ناول تھی جو 1894ء میں بریلی سے "روہیل کھنڈ گزٹ" میں ہفتہ وار شائع ہوتی رہی۔ اس کے بعد "صالحات" نامی ناول لکھا جو 1896 میں مکمل ہوا۔ یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو شائع ہوئی۔ 1897ء میں اپنی شاہکار تصنیف "منازل السائرہ" لکھی اور اسی ناول کی وجہ سے انہیں اردو میں چارلس ڈکنز کے نام سے یاد کیا گیا۔
- علامہ راشد الخیری نے اپنا پہلا طبع زاد افسانہ "نصیر اور خدیجہ" کے عنوان سے لکھا۔ "قطرات اشک" راشد الخیری کے ابتدائی افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں 13 افسانے شامل ہیں۔ جن میں "بدنصیب کا لال"، "ماہ جبین اندرا"، "سارس کی تارک الوطنی"، "رویائے مقصود"، "مظلوم کی فریاد"، "چاندنی چوک کا جنازہ" "ایک مظلوم بیوی کا خط" بہت مشہور ہوئے۔
- سجاد حیدر یلدرم نہٹور ضلع بجنور میں 1880ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو علم و فضل میں بے مثال تھا۔ یلدرم کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید بن امام زین العابدین علیہ السلام سے جاملتا ہے۔
- سید سجاد حیدر یلدرم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1902ء میں کیا اور پہلا مختصر افسانہ 1906ء میں ترکی سے ترجمہ کیا۔
- سجاد حیدر یلدرم نے 1896 سے 1899 تک "معارف" کے معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی۔
- سجاد حیدر یلدرم کا مشہور افسانہ "خارستان و گلستان" جون 1906ء میں رسالہ مخزن لاہور میں چھپا۔
- "خیالستان" سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔
- سلطان حیدر جوش کی افسانہ نگاری کی شروعات 1904ء میں ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ "نابینا بیوی" کے عنوان سے رسالہ "مخزن" دسمبر 1907ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ "تمدن" دہلی میں بھی بہت سے مضامین چھپے۔ ان کے افسانے رسالہ "مخزن، تمدن، الناظر، زمانہ، نقیب، کہکشاں، ہمایوں، نیرنگ، ساقی، سہیل اور نیرنگ خیال کے مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے۔
- سلطان حیدر جوش کے افسانوی مجموعے "فسانہ جوش، اور "جوش فکر" ہیں۔
- علی عباس حسینی 3 فروری 1897ء کو موضع پارہ ضلع غازیپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سے اور انگریزی تعلیم الہ آباد اور لکھنؤ میں رہ کر حاصل کی۔ حسین آباد انٹر کالج کے استاد اور پرنسپل کی خدمات دیتے ہوئے 30 جون 1954ء میں لکھنؤ کے حسین آباد انٹر کالج سے بحیثیت پرنسپل سبکدوش ہوئے اور لکھنؤ ہی میں سکونت اختیار کی۔ 27 ستمبر 1969ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

- علی عباس حسینی کا اسلوب رومانیت لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے رومانیت اور حقیقت پسندی دونوں تحریکوں کے اثرات قبول کیے۔
- ان کے افسانوں میں "رفیق تنہائی، میلہ گھومنی، باسی پھول، ہمارا گاؤں، ندیا کنارے، کانٹوں میں پھول" بہت مشہور ہوئے۔
- علی عباس حسینی نے "رفیق تنہائی"، آئی۔ سی۔ ایس "میلہ گھومنی" "کچھ نہیں" الجھے دھاگے "ہمارا گاؤں میں دیہاتی زندگی، وہاں کے رہنے والوں کا بھولا پن، ان کا خلوص وایثار کی ترجمانی کی ہے۔
- اعظم کریوی 1898ء میں الہ آباد کے ایک گاؤں پاپر گنڈ چائل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی۔ اعلٰی تعلیم کے لیے الہ آباد آئے اور انٹر کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ اعظم کریوی کو طب اور صحافت سے شغف تھا۔ اچھے مترجم بھی تھے۔ بالآخر 1955 میں قتل کر دیئے گئے۔
- اعظم کریوی کے افسانوی مجموعوں میں "پریم کی چوڑیاں، دکھ سکھ، شیخ وبرہمن، انقلاب اور دوسرے افسانے، کنول اور دوسرے افسانے، روپ سنگھار، دل کی باتیں" شامل ہیں۔
- سدرشن اپنے افسانوں میں معاشرے کی اصلاح، نیکی اور اچھائی کی تلقین اور برائیوں سے بچنے کی تبلیغ کرتے رہے۔
- سدرشن کے افسانوں میں سادگی اور جذبات نگاری کا اچھوتا اسلوب ہے۔
- سدرشن نے ہندو متوسط طبقوں کی پریشانیوں کو "شاعر، اپنی طرف دیکھ، خانہ داری کا شیوہ، ترک نمود، صدائے جگر خراش، تبدیل قسمت، دو دوست، فریب دوست" میں بہت ہی اچھے انداز میں اجاگر کیا ہے۔
- "سدا بہار پھول، بہارستان، چندن، قوس وقزح، سولہ سنگھار، چشم وچراغ اور پھول وتی" سدرشن کے افسانوی مجموعے ہیں۔

3.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
منصف	:	انصاف کرنے والا، جج
جماعت	:	کلاس
لعل وگہر	:	ہیرے موتی
توہمات	:	توہم کی جمع، وہم، وسواس، گمان، شک وشبہ
خار	:	کانٹے
گل	:	پھول
متعارف ہونا	:	پہچانا جانا
شکست وریخت	:	تاراجی وناکامی
روپ	:	شکل

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

(i) راشد الخیری کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) حافظ عبد الواحد (b) عبد القادر (c) عبد الناصر (d) عبد اللہ

(ii) "نصیر اور خدیجہ" کس کا افسانہ ہے؟

(a) پریم چند (b) راشد الخیری (c) یلدرم (d) عصمت

(iii) کس ادیب کو مصور غم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

(a) حالیؔ (b) شبلی (c) نذیر احمد (d) راشد الخیری

(iv) سجاد حیدر یلدرم کہاں پیدا ہوئے؟

(a) لکھنؤ (b) نہٹور ضلع بجنور (c) جھانسی (d) بنارس

(v) "خیالستان" کس ادیب کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے؟

(a) سجاد حیدر یلدرم (b) قرۃ العین حیدر (c) پریم چند (d) راشد الخیری

(vi) "نابینا بیوی" کس کا پہلا افسانہ ہے؟

(a) عصمت (b) سلطان حیدر جوش (c) جیلانی بانو (d) سدرشن

(vii) سلطان حیدر جوش کے کتنے افسانوی مجموعے ہیں؟

(a) محمد حسین آزاد (b) شبلیؔ (c) اقبال (d) حالیؔ

(viii) علی عباس حسینی نے عربی وفارسی کی تعلیم کس مدرسے سے حاصل کی؟

(a) سلطان المدارس (b) مدرسہ سلیمانیہ (c) جامعہ ناظمیہ (d) اشرفیہ

(ix) "میلہ گھومنی" کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a) علی عباس حسینی (b) عصمت (c) نیاز فتح پوری (d) اعظم کریوی

(x) اعظم کریوی کا تعلق کس دبستان سے ہے؟

(a) سجاد حیدر یلدرم (b) پریم چند (c) رومانیت (d) جدیدیت

3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. راشد الخیری کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. سلطان حیدر جوشؔ کے افسانوی مجموعوں کا تعارف پیش کیجیے۔
3. سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری بیان کیجیے۔
4. اعظم کریوی کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔
5. سدرشن کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیجیے۔

3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. پریم چند کے ادبی معاصرین میں سے کسی دو کے بارے میں تفصیل سے مضمون لکھیے۔
2. علامہ راشد الخیری کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. پریم چند کی ادبی روایات کو آگے بڑھانے میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے کیا کردار ادا کیا؟ بیان کیجیے۔

3.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
2۔ تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی
3۔ اردو فکشن	آل احمد سرور
4۔ افسانہ: حقیقت سے علامت تک	سلیم اختر
5۔ افسانے کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی

3.6.1 کے جوابات:

A-1	B-2	D-3	B-4	A-5
B-6	A-7	B-8	A-9	B-10

اکائی4: پریم چند کی ادبی خدمات

اکائی کے اجزا

4.0		تمہید
4.1		مقاصد
4.2		پریم چند کی ادبی خدمات
	4.2.1	ناول
	4.2.2	افسانہ
	4.2.3	ڈراما
	4.2.4	تراجم
	4.2.5	خطوط
	4.2.6	مضامین
	4.2.7	ادبی صحافت
4.3		اکتسابی نتائج
4.4		کلیدی الفاظ
4.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	4.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	4.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	4.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
4.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

پچھلے بلاک کی اکائیوں میں آپ نے پریم چند کے عہد کی سماجی و سیاسی حالات، ان کی زندگی کے حالات اور ان کے ادبی معاصرین کا مطالعہ کیا۔ پریم چند کا شمار بیسویں صدی کے اہم اور مؤثر ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع اور ہمہ جہت ہے۔

انہوں نے فکشن کی کئی اصناف جیسے ناول، افسانہ اور ڈراما میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیے، ساتھ ہی تراجم، خطوط، مضامین، اداریے اور صحافتی تحریروں میں بھی اپنی انفرادی شناخت قائم کی۔ اس اکائی میں ہم ان کی انہیں خدمات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- پریم چند کے ناول سے واقف ہو سکیں۔
- پریم چند کے افسانوں پر تبصرہ کر سکیں۔
- پریم چند کے ڈراموں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔
- پریم چند کی ترجمہ نگاری کو سمجھ سکیں۔
- پریم چند کے خطوط پر روشنی ڈال سکیں۔
- پریم چند کے مضامین اور تبصروں پر گفتگو کر سکیں۔

4.2 پریم چند کی ادبی خدمات

پریم چند کی ادبی خدمات برصغیر کے ادبی تاریخ میں ہمہ جہت اور پائیدار حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ نہ صرف بیسویں صدی کے عظیم فکشن نگار تھے بلکہ اپنی تخلیقی وسعت، سماجی بصیرت اور عوامی وابستگی کے باعث انہوں نے ادب کو نئی سمت، نئے موضوعات اور نئے رجحانات عطا کیے۔ ان کا قلم زندگی کے انتہائی گہرے اور تلخ حقائق کی ترجمانی میں ہمیشہ سرگرم رہا اور انہوں نے لفظوں کے ذریعے عام انسان کے دکھوں، محرومیوں اور امیدوں کو وہ آواز دی جو اس سے پہلے فکشن میں کم ہی سنائی دیتی تھی۔

پریم چند کی ادبی خدمات اپنی وسعت، گہرائی اور اثر پذیری کے اعتبار سے اردو اور ہندی ادب میں ایک بے مثال مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے فکشن کے تقریباً ہر گوشے کو اپنی تخلیقی قوت سے روشن کیا۔ ناول، افسانہ، مضامین، ڈرامے، تراجم، خطوط، ادبی صحافت وغیرہ۔ ادب کے ان تمام میدان میں وہ اپنے عہد کی نمایاں ترین آواز بن کر ابھرے۔ اُن کی غیر معمولی خدمات نے انہیں ''کہانی کار رہنما''، ''نئی کہانی کا معمار'' اور ''قلم کا سپاہی'' جیسے متعدد معزز القاب عطا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو فکشن کو ٹھوس بنیاد فراہم کرنے والے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

پریم چند کے وسیع اور متنوع ادبی سرمایے کو مدن گوپال نے نہایت محنت اور علمی دیانت کے ساتھ چوبیس (24) جلدوں پر مشتمل کلیات کی صورت میں مرتب کیا ہے، جسے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی نے شائع کیا۔ یہ کلیات پریم چند کے پورے ادبی سفر کا جامع احاطہ کرتی ہے اور ان کی تخلیقات کو باقاعدہ موضوعاتی ترتیب کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

ان چوبیس جلدوں کی تقسیم اس طرح ہے:

جلد 1 سے 8: تمام ناول

جلد 9 سے 14: افسانوی مجموعے

جلد 15 اور 16: ڈرامے

جلد 17: خطوط

جلد 18 اور 19: تراجم

جلد 20 سے 24: مضامین اور متفرق تحریریں

اس طرح یہ کلیات پریم چند کی ادبی وسعت، فکری تنوع اور تخلیقی سفر کی مکمل دستاویز بن کر سامنے آتی ہے، جو محققین، طلبہ اور ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔

4.2.1 ناول:

پریم چند کی ادبی زندگی شبابِ جوانی ہی میں شروع ہوگئی تھی۔انھوں نے کل تیرہ ناول تحریر کیے، جن میں آخری ناول "منگل سوتر" ان کے انتقال کے باعث نامکمل رہ گیا۔ان کی ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز "اسرارِ معابد" سے ہوا جو 1903 سے 1905 تک بنارس کے ہفت روزہ "آوازِ خلق" میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔اس زمانے میں وہ دھنپت رائے کے نام سے لکھتے تھے اور اسی نام کی مناسبت سے ناول میں مصنف کا تذکرہ نواب رائے کے طور پر ملتا ہے۔

پریم چند برِّصغیر کی ناول نگاری کے سب سے معتبر اور سماجی حقیقت کو فن میں ڈھالنے والے اہم ادیب ہیں۔ان کے ناول ہندوستانی معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں جن میں دیہی زندگی کی محرومیاں، معاشی نابرابری، کسانوں کی جدوجہد، عورتوں کے مسائل اور ذات پات کے جبر جیسے مسائل گہری ہمدردی کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔

پریم چند کے یہاں مقصدیت اور حقیقت نگاری بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ان کی نثر سادہ، رواں اور عوامی لہجے سے قریب ہے، اسی لیے ان کے ناول قاری کے دل پر براہِ راست اثر ڈالتے ہیں۔کردار نگاری ان کی بڑی خوبی ہے؛ ان کے کردار نہ صرف حقیقی معلوم ہوتے ہیں بلکہ انسان کے باطنی دکھ اور سماجی دباؤ دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ان کے ناول موضوعات کے اعتبار سے وسیع ہیں۔گئودان میں کسان کی جدوجہد، نرملامیں معاشرتی ناانصافی اور دیگر ناولوں میں اخلاقی و سماجی کشمکش فنی صلاحیت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔مضبوط پلاٹ، فطری واقعات، مؤثر مکالمے اور سماجی شعور ان کی ناول نگاری کو ایک ادبی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت دیتے ہیں۔مجموعی طور پر پریم چند کی ناول نگاری حقیقت پسندی، انسان دوستی، اصلاحی فکر اور سادگیِ بیان کا ایسا حسین امتزاج ہے جس نے انہیں برِّصغیر کا سب سے بڑا حقیقت نگار ناول نگار بنا دیا ہے۔پریم چند کے درج ذیل ناول شائع ہوئے ہیں:

1۔ اسرار معابد (نامکمل)	2۔ ہم خرماوہم ثواب(1906ء)
3۔ کشنا(1907ء)	4۔ جلوہئ ایثار(1912ء)
5۔ بازارِ حسن(1922ء)	6۔ چوگان ہستی(1927ء)
7۔ گوشہئ عافیت(1928ء)	8۔ نرملا(1929ء)
9۔ غبن(1931ء)	10۔ بیوہ(1906ء)
11۔ میدانِ عمل(1935ء)	12۔ گؤدان(1936ء)
13۔ منگل سوتر(نامکمل)	

4.2.2 افسانہ:

اردو افسانے کے ارتقا میں پریم چند کی خدمات سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح انھوں نے ناول کو نئی سمت عطا کی، ویسے ہی افسانے کو بھی نئی جہت، نئی تازگی اور حقیقی سماجی شعور بخشا۔ پریم چند کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے افسانے کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے سماج کے آئینے میں بدل دیا۔ ان کے کردار زندگی سے اٹھائے ہوئے، زبان سادہ، فطری اور عوامی اور موضوعات براہِ راست ہندوستانی معاشرے کے دکھ درد سے جڑے ہوئے ہیں۔

پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا انمول رتن" اپریل 1907 میں رسالہ زمانہ (کانپور) میں منظر عام پر آیا۔ اگلے ہی برس 1908 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" شائع ہوا، مگر برطانوی حکومت نے اسے باغیانہ خیالات کا حامل قرار دے کر ضبط کرلیا۔ اس کے باوجود پریم چند کی تخلیقی قوت ماند نہ پڑی اور ایک کے بعد ایک مجموعے سامنے آتے گئے۔

پریم چند نے اس وقت افسانہ لکھنا شروع کیا جب راشدالخیری اور سجاد حیدر یلدرم جیسے فنکار اپنی رومانوی اور شہری زندگی پر مبنی کہانیوں کے ساتھ مقبول تھے۔ لیکن پریم چند نے اس رجحان سے ہٹ کر ایک بالکل نئی راہ اختیار کی۔ وہ دیہات گئے، کسانوں، مزدوروں، عورتوں، بچوں اور نچلے طبقات کے دکھ سکھ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس طرح اردو افسانہ پہلی بار حقیقی ہندوستانی زندگی کی نبض پر ہاتھ رکھ پایا۔

ان کے ابتدائی افسانوں میں اصلاحی رنگ اور مثالی فکر غالب نظر آتی ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کے مشاہدات گہرے ہوئے، سیاسی فضا میں تغیر آیا، سماجی درد بڑھا اور یہ سب کچھ ان کی تحریروں میں بھی پختگی کی صورت میں جھلکتا گیا۔ آخری دور کے افسانے مثلاً کفن، دکھی چمار فکری گہرائی اور فنی پختگی کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ یوں پریم چند نے افسانے کو محض ایک صنف نہیں بلکہ ایک سماجی تحریک میں بدل دیا اور یہی ان کی افسانہ نگاری کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ذیل میں پریم چند کے افسانوی مجموعے درج ہیں:

1۔ سوز وطن (1908ء)	2۔ پریم پچیسی (1915ء)

3۔	پریم بتیسی(1920ء)	4۔	خاک پروانہ(1928ء)
5۔	خواب و خیال(1928ء)	6۔	فردوس خیال(1929ء)
7۔	پریم چالیسی(1930ء)	8۔	آخری تحفہ(1934ء)
9۔	زاد راہ(1936ء)	10۔	دودھ کی قیمت(1937ء)
11۔	واردات(1938ء)		

ان مجموعوں کے علاوہ بھی متعدد لوگوں نے ان کے افسانوں کے انتخاب شائع کیے ہیں، جن میں پریم چند کے دلت افسانے، دیہات کے افسانے، میرے بہترین افسانے، پریم چند کی کہانیاں، پریم چند کے شاہکار افسانے وغیرہ شامل ہیں۔

6.2.3 ڈراما:

ناول اور افسانے کے میدان میں اپنی غیر معمولی فنی مہارت کے بعد منشی پریم چند نے ڈرامہ نگاری میں بھی قدم رکھا اور یہاں بھی اپنی تخلیقی قوتوں کو آزماتے ہوئے چند اہم تصانیف پیش کیں۔ اگرچہ ڈرامہ ان کا بنیادی فن نہیں تھا، پھر بھی انہوں نے اس صنف میں جو کام کیا، وہ ان کی ادبی دلچسپیوں کی وسعت اور اظہارِ خیال کی ہمہ جہتی کا ثبوت ہے۔

پریم چند کے دو طبع زاد اردو ڈرامے "روحانی شادی" اور "کربلا" ہیں۔ ان میں "کربلا" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس ڈرامے میں انہوں نے شہادتِ امام حسینؓ اور کربلا کے واقعے کو موضوع بنایا اور اس کے لیے باقاعدہ تحقیقی مطالعہ بھی کیا۔ ڈرامے میں واقعات کی ترتیب، تاریخی پس منظر اور کرداروں کی پیش کش ان کی سنجیدگی اور تاریخ فہمی کی دلیل ہے۔ مذہبی جذبات کے احترام اور واقعات کے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے اس سانحے کی ڈرامائی تشکیل پریم چند کی فنی احتیاط کا مظہر ہے۔

ان کا ہندی میں لکھا گیا ڈراما "سنگرام" بھی خاصا معروف ہوا، جسے بعد میں اردو میں بھی پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ ڈرامے انگریزی سے ترجمہ کیے جن میں "شبِ تار"، "چاندی کی ڈبیا"، "ہڑتال" اور "انصاف" شامل ہیں۔ چونکہ یہ ترجمے براہِ راست انگریزی اسلوب کے پابند تھے، اس لیے ان کی زبان نسبتاً مشکل اور کم رواں محسوس ہوتی ہے، جو پریم چند کے سادہ اور عوامی اسلوب سے کچھ حد تک مختلف ہے۔

فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد پریم چند نے دو ڈرامے فلموں کے لیے لکھے۔ "مزدور" اور "شیر دل عورت" جن میں سماجی شعور اور طبقاتی کشمکش واضح طور پر نمایاں ہے۔ تاہم، جب انہوں نے فلمی صنعت سے وابستگی ختم کی، تو ڈرامہ نگاری کا سلسلہ بھی خود بخود منقطع ہوگیا اور وہ دوبارہ اس صنف کی جانب پوری طرح متوجہ نہ ہو سکے۔ فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو پریم چند کے ڈرامے ان کے ناولوں اور افسانوں کی طرح مضبوط نہیں۔ ان میں اسٹیج تکنیک، مکالمہ نگاری، ڈرامائی تصادم اور اسٹیج کی ضروری فنی ساخت وہ پختگی نہیں رکھتی جو ایک بڑے ڈرامہ نگار کی پہچان ہوتی ہے۔ پھر بھی ان ڈراموں میں انہوں نے کئی مؤثر کردار تراشے اور موضوعات کو سماجی حقیقت سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔

ناول اور افسانے کی طرح ڈرامہ نگاری میں پریم چند بڑا مقام کیوں نہ حاصل کر سکے؟ اس کی ایک بڑی وجہ ان کی بے پناہ مصروفیت تھی۔ ناول اور افسانے کے مسلسل تخلیقی دباؤ کے ساتھ ساتھ صحافت، ادارت، سماجی سرگرمیوں اور فلمی مصروفیات نے انہیں ڈرامے کے فن پر وہ توجہ دینے نہیں دی جس کی اس صنف کو ضرورت ہوتی ہے۔ پھر بھی، ڈرامے کی دنیا میں ان کی موجودگی ان کے ادبی سفر کا ایک اہم باب ہے، جو ان کی فکری ہمہ گیری، موضوعاتی وسعت اور فن کے مختلف شعبوں میں دلچسپی کی علامت ہے۔

4.2.4 تراجم:

پریم چند کی ادبی زندگی میں ترجمہ نگاری ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ان کی اصل شناخت ناول، افسانے اور صحافت کے ذریعے بنی، لیکن ایک مترجم کے طور پر بھی انہوں نے اردو ادب کو معتبر سرمایہ عطا کیا۔ ان کی ترجمہ نگاری نہ صرف عالمی ادب کے ساتھ ایک تخلیقی مکالمہ تھی بلکہ اس کے ذریعے انہوں نے اپنے سماج کے قارئین کو نئے افکار، نئی تکنیکوں اور مختلف تہذیبی رویّوں سے روشناس کرایا۔

پریم چند نے ترجمہ کو محض لفظوں کی تبدیلی نہیں سمجھا۔ وہ ترجمے کو علم و ادب کے تبادلے کا اہم ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی بیرونی ادب کے جوہر، کرداروں کے جذبات اور تہذیبی پیغام کو اس طور پر اردو میں منتقل کیا جائے کہ اصل کی روح بھی برقرار رہے اور اردو قاری کو پڑھنے میں اجنبیت بھی محسوس نہ ہو۔

پریم چند نے بطور خاص ڈرامے کے فن سے گہری دلچسپی لی، اور اسی دلچسپی کے تحت انہوں نے چند اہم انگریزی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا، جن میں "شبِ تار"، "چاندی کی ڈبیا"، "ہڑتال"، "انصاف" وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ڈرامے انگریزی ادب سے ماخوذ تھے اور زبان کے اعتبار سے پیچیدہ تھے، مگر پریم چند نے ترجمے میں بے جا مقامی رنگ دینے کے بجائے اصل فضا کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی معروف سادگی، روانی اور موثر پیرایہ اظہار سے کام لیا۔

پریم چند نے مشکل انگریزی جملوں کو ایسی سلیس اور رواں اردو میں بدل دیا کہ عام قاری بھی آسانی سے سمجھ سکے۔ انہوں نے کسی بھی ترجمے میں کہانی کے اسلوب، کرداروں کی نفسیات اور واقعات کی ترتیب کو بگاڑے بغیر اردو زبان کا قالب عطا کیا۔ پریم چند کا مقصد قاری تک فکر کی وضاحت پہنچانا تھا، اسی لیے انہوں نے ترجموں میں پیچیدہ تعبیرات یا مہمل عبارت آرائی سے ہمیشہ گریز کیا۔ جہاں ضرورت پڑتی، وہاں انہوں نے ایسے الفاظ یا تشریحات شامل کیں جو اردو بولنے والے معاشرے کو اجنبی فضا کو سمجھنے میں مدد دیں۔ اگرچہ پریم چند کی اصل شہرت افسانہ اور ناول کے میدان سے وابستہ ہے، لیکن ان کی ترجمہ نگاری اردو ادبی تاریخ میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں ترجمے کے ذریعے عالمی ادب کے دروازے کھولے۔ ان کے ترجموں میں مقصدیت، سماجی شعور اور عملی حقیقت پسندی جھلکتی ہے۔ ترجمے نے ان کے اپنے فکشن کو بھی تقویت پہنچائی، کیونکہ اس عمل نے ان کی نظر کو زیادہ وسیع اور بین الاقوامی بنایا۔

مجموعی طور پر پریم چند کی ترجمہ نگاری ان کے ادبی کارناموں کا اہم حصہ ہے۔اگرچہ یہ حصہ ان کی اصل تخلیقات کے مقابلے میں کم نمایاں ہے، لیکن اس کی قدر و وقعت اپنی جگہ مسلم ہے۔ان کے ترجمے نہ صرف اُن کی وسیع مطالعہ پسندی کے مظہر ہیں بلکہ اردو ادب کے لیے ایک قیمتی تحفہ بھی ہیں۔

4.2.5 خطوط:

پریم چند نہ صرف ایک عظیم افسانہ اور ناول نگار تھے بلکہ ایک بہترین خطاط اور خط نگار بھی تھے۔ان کی خطوط نگاری ادب کی ایک نازک صنف ہے، جس میں خیالات کی روانی، اخلاقی شعور اور سماجی شعور کو بڑے اثر انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔خطوط نگاری کے ذریعے پریم چند نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی حقیقتوں کو قاری تک پہنچانے کا ایک انوکھا ذریعہ اختیار کیا۔

پریم چند کی خطوط نگاری کی بنیاد ان کے ذاتی مشاہدات، ادبی تجربات اور سماجی مشاہدات پر استوار تھی۔وہ خطوط کے ذریعے نہ صرف اپنی رائے کا اظہار کرتے بلکہ قاری کو مختلف موضوعات پر سوچنے اور غور کرنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔ ان کے خطوط علمی، ادبی اور سماجی تناظر کے حامل ہوتے تھے اور ہر خط میں ایک مقصد یا فکر کی جھلک واضح نظر آتی تھی۔

پریم چند کے خطوط میں زبان سادہ اور فہم میں آسان ہوتی تھی، جس سے قارئین ہر عمر اور طبقے کے اسلوب کو سمجھ سکتے تھے۔خطوط میں خیالات کو منطقی اور منظم انداز میں پیش کیا گیا، جس سے قاری پر اثر واضح ہوتا ہے۔اکثر خطوط میں سماجی اصلاح، اخلاقی شعور اور عوامی فلاح کے موضوعات شامل ہوتے تھے۔وہ اپنے خطوط میں ذاتی تجربات، مشاہدات اور ادبی مطالعے کا تذکرہ بھی کرتے، جو ان کے دیگر ادبی کاموں کے لیے ایک فکری بنیاد کا کام دیتا۔

پریم چند کے خطوط مختلف موضوعات پر لکھے گئے، جن میں ادبی مسائل اور تخلیقی فنون، سیاسی حالات اور قومی شعور،سماجی مسائل، جیسے تعلیم، غربت، عورت کی حالت، ذاتی تجربات اور ادبی تبادلے شامل ہیں۔یہ خطوط نہ صرف ادب کی فکری اہمیت رکھتے ہیں بلکہ ایک تاریخ ساز دستاویز بھی ہیں جو اس دور کے حالات اور معاشرتی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ پریم چند کی خطوط نگاری اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ان کی خطوط نگاری میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ان کے افسانوی اور ناول نگاری میں بھی ملتی ہیں۔مثلاً حقیقت پسندی، انسانی ہمدردی،سماجی شعور،اخلاقی و فکری بصیرت وغیرہ۔ خطوط کی یہ خصوصیات پریم چند کے ادبی کمالات کی ایک اور جھلک ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ صرف افسانہ اور ناول کے ماہر نہیں بلکہ ادبی بصیرت کے حامل ایک جامع ادیب تھے۔

پریم چند کی خطوط نگاری اردو ادب میں فکری گہرائی، سادگی اور اخلاقی شعور کا حسین امتزاج ہے۔خطوط کے ذریعے وہ نہ صرف اپنے خیالات، تجربات اور مشاہدات بیان کرتے بلکہ معاشرتی شعور بیدار کرنے اور قاری کو فکر کی دعوت دینے کا ذریعہ بھی فراہم کرتے۔ان کی خطوط نگاری ان کی ادبی شخصیت کا اہم اور منفرد پہلو ہے، جو ان کے دیگر ادبی کاموں کے

مکمل سیاق و سباق کو مضبوط کرتی ہے۔

4.2.6 مضامین:

پریم چند نے محض افسانوی ادب تک اپنے قلم کو محدود نہیں رکھا، بلکہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں غیر معمولی تعداد میں مضامین بھی تحریر کیے۔ان کی نثر میں جو سادگی، روانی اور فکر کی پختگی ملتی ہے وہ انہیں عصرِ حاضر کے بڑے نثر نگاروں میں ممتاز کرتی ہے۔اردو میں ان کے ستائیس سوانحی اور دس تنقیدی مضامین شائع ہوئے جن سے ان کی وسیع مطالعہ، تاریخ فہمی اور ادبی شعور کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اپنی سوانحی تحریروں میں انہوں نے اکبر اعظم، راجا ٹوڈر مل، راجا مان سنگھ، مہاراجا رنجیت سنگھ، رانا پرتاپ، چترنجن داس، سوامی وویکا نند، گوپال کرشن گوکھلے، بدرالدین طیب جی، شیخ سعدی، سر سید احمد خاں، منشی ذکاء اللہ اور مولانا عبدالحلیم شرر جیسے مختلف تاریخی، مذہبی اور فکری شخصیات کے حالاتِ زندگی نہایت سہل زبان میں بیان کیے۔ان کے یہ مضامین نہ صرف تاریخی معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ ان شخصیات کے کردار اور انسانیت کے لیے ان کی خدمات کی معنویت بھی اجاگر کرتے ہیں۔

تنقید کے میدان میں بھی پریم چند نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ناول اور افسانے کے فن پر لکھے گئے ان کے مضامین فکشن کی تکنیک، اسلوب، موضوع اور ساخت پر روشنی ڈالتے ہیں۔"زمانہ"، "آوازِ خلق" اور "مخزن" جیسے معتبر رسائل میں شائع ہونے والے ان کے تنقیدی مضامین ادب کی جمالیات اور فن کے بنیادی اصولوں پر گہری بصیرت پیش کرتے ہیں۔"قوتِ بیانیہ"، "کلامِ اکبر پر ایک نظر"، "کالی داس کی شاعری"، "ناول کا فن"، "ناول کا موضوع"، "مختصر افسانے کا فن" اور "ادب کی غرض و غایت" ان کے تنقیدی مقالوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس میں پیش کیا گیا ان کا صدارتی خطبہ اردو ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس خطبے میں انہوں نے ادب کے مقصد، سماج سے اس کے تعلق اور انسانی زندگی میں اس کی افادیت پر نہایت مدلل اور باوقار گفتگو کی، جس نے آنے والے ادیبوں کے نظریاتی رجحانات پر گہرا اثر چھوڑا۔پریم چند نے لسانی مسائل سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔"اردو، ہندی، ہندوستانی" کے عنوان سے ان کا معروف مضمون 1935ء میں "زمانہ" میں شائع ہوا، جس میں انہوں نے دونوں زبانوں کے باہمی رشتے اور ہندوستانی قومیت کے تناظر میں ان کی معنویت پر بصیرت افروز بحث کی۔مزاحیہ مضامین میں بھی پریم چند نے خوب طبع آزمائی کی۔اردو میں ان کے گیارہ مزاحیہ مضامین محفوظ ہیں جن میں "قحط الرجال"، "گالیاں"، "ہنسی"، "ہاتھی دانت" اور "فنِ تصویر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ان مضامین میں ان کا انداز ہلکا پھلکا، طنزیہ اور مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے، جو ان کی نثر کو مزید دلکش بنا دیتا ہے۔

4.2.7 ادبی صحافت:

پریم چند بطور ادیب ہی نہیں، ایک دیانت دار، اصول شناس اور ذمہ دار صحافی کے طور پر بھی بے حد معتبر مقام رکھتے ہیں۔ان کی صحافتی زندگی کا آغاز منشی نول کشور کے معزز رسالے"زمانہ"سے ہوا، جہاں انہوں نے پہلی مرتبہ قلم کو صحافت کے میدان میں آزماتے ہوئے اپنی فکری سمت کا واضح تعین کیا۔ بعد ازاں وہ نول کشور پریس کے ہندی رسالے"مادھوری"کے مدیر مقرر ہوئے اور جولائی 1928 سے نومبر 1931 تک پوری جانفشانی سے ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

کانپور سے بنارس منتقل ہونے کے بعد انہوں نے جنوری 1930 میں"ہنس"کے نام سے ایک نیا رسالہ جاری کیا، جو کم عرصے میں ہندی کے معیاری اور سنجیدہ ادبی جرائد میں شامل ہو گیا۔پریم چند نے سرسوتی پریس بھی قائم کیا اور تین برس بعد، اگست 1933 میں ہفتہ وار اخبار"جاگرن" نکال کر صحافت کے میدان میں اپنے عزم کو مزید مستحکم کیا۔

ایک صحافی کی حیثیت سے پریم چند نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کے ہر پہلو کو جس بے باکی، صداقت اور فکری دیانت داری سے پیش کیا، وہ ان کے غیر معمولی حوصلے اور عوام سے گہری وابستگی کی دلیل ہے۔وہ ہمیشہ سچ کو سامنے لانے کے قائل رہے اور کبھی یہ مصلحت نہیں برتی کہ کسی سچائی کو بیان کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ آزادیِ اظہار، تحریر و تقریر کی آزادی اور قومی شعور کی بیداری،یہ تین ستون ان کے صحافتی نقطۂ نظر کے بنیادی اجزا تھے۔

"ہنس" اور "جاگرن" میں شائع ہونے والے ان کے اداریے اور مضامین آج بھی ان کی جرات مندانہ سوچ کا ثبوت ہیں۔وہ ایک سچے قوم پرست تھے اور ملکی مسائل پر بے لاگ رائے پیش کرنے سے کبھی نہیں گھبرائے۔یہی بے باکی تھی جس کے باعث انہیں اکثر حکومت کے غضب کا سامنا کرنا پڑا۔متعدد بار ان سے بھاری ضمانت طلب کی گئی، کئی مرتبہ ان کے رسائل کی اشاعت روک دی گئی، اور مالی دشواریاں ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں۔

پریم چند کے رسالے مسلسل خسارے میں جا رہے تھے، مگر وہ ان کی بندش کو اپنی فکری شکست سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ سرسوتی پریس کے مالی نقصان کی تلافی کے لیے وہ مجبوراً بمبئی گئے اور فلمی کہانیاں لکھ کر پریس کے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کی۔یہ واقعہ خود اس امر کا ثبوت ہے کہ صحافت سے ان کی وابستگی محض پیشہ نہیں، بلکہ ایک گہرا عقیدہ اور اصولی عہد تھا۔

مختصر یہ کہ پریم چند اردو اور ہندی ادب کے وہ عظیم ادیب ہیں جنہوں نے ناول، افسانہ، ڈرامہ، خطوط، ترجمہ اور ادبی صحافت کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔انہوں نے ناول اور افسانے میں دیہی زندگی، عوامی مسائل، سماجی ناانصافی اور انسانی ہمدردی کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا۔افسانوں میں ان کا اصلاحی رجحان اور حقیقی کرداروں کی عکاسی اردو ادب کے لیے سنگِ میل ہے۔

ڈراما نگاری میں انہوں نے چند اہم ڈرامے تخلیق کیے اور کچھ ڈرامے انگریزی سے ترجمہ کیے، جب کہ ترجمہ نگاری کے ذریعے عالمی ادب کے خیالات اردو قارئین تک پہنچائے۔خطوط کے ذریعے وہ ذاتی مشاہدات، سماجی حقائق اور ادبی رائے

بیان کرتے تھے اور صحافت میں انہوں نے اپنے رسائل "زمانہ"، "مادھوری"، "ہنس" اور "جاگرن" کے ذریعے عوامی شعور بیدار کیا۔

مجموعی طور پر پریم چند کی ادبی خدمات حقیقت پسندی، اصلاحی فکر، سماجی شعور اور فنی پختگی کا حسین امتزاج ہیں، جو انہیں اردو ادب کا جامع ستون اور جدید ہندوستانی فکشن کا بانی بناتی ہیں۔

4.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- پریم چند کی ادبی خدمات برصغیر کے ادبی تاریخ میں ہمہ جہت اور پائیدار حیثیت رکھتی ہیں۔
- پریم چند نہ صرف بیسویں صدی کے عظیم فکشن نگار تھے بلکہ اپنی تخلیقی وسعت، سماجی بصیرت اور عوامی وابستگی کے باعث انہوں نے ادب کو نئی سمت، نئے موضوعات اور نئے رجحانات عطا کیے۔
- پریم چند اردو اور ہندی ادب کے وہ عظیم ادیب ہیں جنہوں نے ناول، افسانہ، ڈرامہ، خطوط، ترجمہ اور ادبی صحافت کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔
- پریم چند کے وسیع اور متنوع ادبی سرمایے کو مدن گوپال نے نہایت محنت اور علمی دیانت کے ساتھ چوبیس (24) جلدوں پر مشتمل کلیات کی صورت میں مرتب کیا ہے، جسے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی نے شائع کیا۔
- ان چوبیس جلدوں کی تقسیم اس طرح ہے:
  - جلد 1 سے 8: تمام ناول
  - جلد 9 سے 14: افسانوی مجموعے
  - جلد 15 اور 16: ڈرامے
  - جلد 17: خطوط
  - جلد 18 اور 19: تراجم
  - جلد 20 سے 24: مضامین اور متفرق تحریریں
- پریم چند کی ادبی زندگی شبابِ جوانی ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ انھوں نے کل تیرہ ناول تحریر کیے، جن میں آخری ناول "منگل سوتر" ان کے انتقال کے باعث نامکمل رہ گیا۔
- اردو افسانے کے ارتقا میں پریم چند کی خدمات سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پریم چند کا پہلا افسانہ "عشقِ دنیا اور حبِ وطن" اپریل 1907 میں رسالہ زمانہ (کانپور) میں منظر عام پر آیا۔ اگلے ہی برس 1908 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" شائع ہوا۔

- پریم چند کے دو طبع زاد اردو ڈرامے ''روحانی شادی''اور''کربلا''ہیں۔ان میں ''کربلا'' خاص اہمیت رکھتا ہے۔
- پریم چند کی ادبی زندگی میں ترجمہ نگاری ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ایک مترجم کے طور پر بھی انہوں نے اردو ادب کو معتبر سرمایہ عطا کیا۔
- مضمون کے میدان میں بھی پریم چند نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ناول اور افسانے کے فن پر لکھے گئے ان کے مضامین فکشن کی تکنیک، اسلوب، موضوع اور ساخت پر روشنی ڈالتے ہیں۔''قوتِ بیانیہ''، ''کلامِ اکبر پر ایک نظر''، ''کالی داس کی شاعری''، ''ناول کا فن''، ''ناول کا موضوع''، ''مختصر افسانے کا فن'' اور ''ادب کی غرض و غایت'' ان کے تنقیدی مقالوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔
- پریم چند کے خطوط مختلف موضوعات پر لکھے گئے، جن میں ادبی مسائل اور تخلیقی فنون، سیاسی حالات اور قومی شعور،سماجی مسائل، جیسے تعلیم، غربت، عورت کی حالت، ذاتی تجربات اور ادبی تبادلے شامل ہیں۔
- پریم چند بطور ادیب ہی نہیں، ایک دیانت دار، اصول شناس اور ذمہ دار صحافی کے طور پر بھی بے حد معتبر مقام رکھتے ہیں۔ان کی صحافتی زندگی کا آغاز منشی نول کشور کے معزز رسالے''زمانہ''سے ہوا۔
- پریم چند کی غیر معمولی ادبی،سماجی، سیاسی خدمات نے انہیں ''کہانی کا رہنما''، ''نئی کہانی کا معمار'' اور ''قلم کا سپاہی'' جیسے متعدد معزز القاب عطا کیے۔
- پریم چند کی ادبی خدمات حقیقت پسندی، اصلاحی فکر، سماجی شعور اور فنی پختگی کا حسین امتزاج ہیں، جو انہیں اردو ادب کا جامع ستون اور جدید ہندوستانی فکشن کا بانی بناتی ہیں۔

4.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ہمہ جہت	:	ہر پہلو سے مکمل، کئی خصوصیات یا شعبوں پر مشتمل
فکری تنوع	:	سوچ اور خیالات کی گوناگونی، مختلف نظریات کا ہونا
دستاویز	:	تحریری ثبوت، کاغذی ریکارڈ، کوئی سرکاری یا معتبر تحریر
برصغیر	:	ہندوستان، پاکستان،بنگلہ دیش اور آس پاس کے خطے پر مشتمل جنوبی ایشیا کا علاقہ
فلمی صنعت	:	فلمیں بنانے، تیار کرنے اور دکھانے سے متعلق شعبہ؛ سینما کی دنیا
مہمل عبارت	:	بے معنی جملہ یا ایسی بات جس میں کوئی مفہوم نہ ہو
منطقی	:	عقل و دلیل پر مبنی، سلیقے سے سوچا ہوا
امتزاج	:	ملاپ، آمیزش، مختلف چیزوں کا مل جانا

مزاحیہ مضامین : ہنسی مذاق پر مبنی تحریریں؛ طنز و مزاح کے مضامین

اصول شناس : اصولوں پر چلنے والا، ضابطوں کا پابند شخص

جانفشانی : مکمل محنت، دل لگا کر کام کرنا، لگن اور لگاتار کوشش

قوم پرست : اپنے ملک اور قوم کے مفاد کو اولین اہمیت دینے والا، قوم سے محبت رکھنے والا

سنگِ میل : نمایاں کامیابی یا اہم پڑاؤ، ایسا کارنامہ جو تاریخ میں نشان چھوڑ جائے

4.5 نمونۂ امتحانی سوالات

4.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ کلیات پریم چند کتنی جلدوں پر مشتمل ہے؟

(a) 24 (b) 20 (c) 16 (d) 13

2۔ پریم چند نے کل کتنے ناول لکھے؟

(a) آٹھ (b)دس (c)تیرہ (d)پندرہ

3۔ ناول "گئودان" کب لکھا گیا؟

(a) 1880 (b) 1903 (c)1930 (d) 1936

4۔ پریم چند کا آخری ناول کون سا ہے؟

(a) منگل سوتر (b)چوگان ہستی (c)نرملا (d)بیوہ

5۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ کون سا ہے؟

(a) فردوس خیال (b)خواب وخیال (c)سوز وطن (d)واردات

6۔ پریم چند کا مشہور ڈراما کون سا ہے؟

(a) روحانی شادی (b)کربلا (c)ہڑتال (d)چاندی کی ڈبیا

7۔ ذیل میں سے کون افسانوں کا مجموعہ ہے؟

(a) خواب وخیال (b)غبن (c)اسرار معابد (d)بازار حسن

8۔ کلیات پریم چند کی 17 ویں جلد کس صنف پر مشتمل ہے؟

(a) افسانہ (b)ڈراما (c)خطوط (d)مضامین

9۔ کلیات پریم چند کی کتنی جلدیں افسانوں پر مشتمل ہیں؟

(a) گیارہ (b)پندرہ (c) سات (d) پانچ

10۔ اردو افسانے کی ابتدا کس سے ہوتی ہے؟

(a)پریم چند (b)کرشن چندر (c)راجندر سنگھ بیدی (d)سعادت حسن منٹو

4.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کی ڈرامانگاری پر مضمون لکھیے۔

2۔ پریم چند کے خطوط پر سیر حاصل گفتگو کیجیے۔

3۔ پریم چند کے مضامین کی اہمیت واضح کیجیے۔

4۔ پریم چند کے تراجم پر نوٹ لکھیے۔

5۔ پریم چند کی ادبی صحافت پر روشنی ڈالیے۔

4.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ پریم چند کی ناول نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

3۔ پریم چند کے افسانوں پر روشنی ڈالیے۔

4.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24) مرتبہ: مدن گوپال

2۔ منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے ڈاکٹر قمر رئیس

3۔ پریم چند ہنس راج رہبر

4۔ پریم چند ایک نقیب پروفیسر صغیر افراہیم

5۔ توقیت پریم چند مانک ٹالا

4.5.1 کے جوابات:

A-1	C-2	D-3	A-4	C-5
B-6	A-7	C-8	D-9	A-10

اکائی 5 : پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات

5.3 اکتسابی نتائج

5.4 کلیدی الفاظ

5.5 نمونہ امتحانی سوالات

5.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

اردو افسانے کی باقاعدہ شروعات بیسویں صدی کے آغاز میں اصلاحی نوعیت کی تحریروں سے ہوئی۔ چند ہی برسوں میں یہ صنف اردو ادب کی سب سے زیادہ پسند کی جانے والی اصناف میں شامل ہوگئی۔ ابتدائی دور کے جن افسانہ نگاروں نے اصلاحی رجحان کو فروغ دیا، ان میں پریم چند کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انہیں اصلاحی ادب کا علمبردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ پریم چند نے نہ صرف اپنے دور کے مسائل کو سمجھا بلکہ گہری بصیرت اور شعوری ادراک کے ساتھ سماجی زندگی کی عکاسی بھی کی۔ اس اکائی میں ہم ان کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خصوصیات بیان کریں گے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اردو افسانوی ادب کی تعمیر و ترقی میں منشی پریم چند کی فکری، فنی، سماجی، اور اخلاقی جہات کا جامع جائزہ لے سکیں۔

- پریم چند کے افسانوں میں انسانی ہمدردی، مساوات، اور عدل و انصاف کے نظریات کی تشریح کر سکیں۔
- ان کے افسانوں میں پیش کردہ معاشرتی برائیوں، طبقاتی ناہمواری، اور دیہی زندگی کی عکاسی کو نمایاں کر سکیں۔
- پریم چند کی تخلیقات میں عورت کے ترقی اور عروج کے نظریات کو سمجھ سکیں۔

5.2 پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات

افسانوی ادب کی تعمیر و ترقی میں پریم چند کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس صنف میں ان کے کارنامے اور ان کا سرمایہ فکر و فن جس وسعت کا حامل ہے اردو افسانے کا کوئی دوسرا ادیب اس حیثیت اور اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا۔ وہ اردو زبان کے افسانوی افق پر ایک ایسے چمکتے ہوئے آفتاب کے مانند ہیں جس کی روشن شعاعوں سے ادبی دنیا خصوصیت سے افسانوی ادب نہ صرف روشن ہوئی بلکہ اس روشنی میں افسانوی ادب کا ایک کارواں آگے بڑھتا رہا ہے۔ پریم چند ادبی دنیا میں ہندوستانی ادب کی مستند اور اعلیٰ پہچان بن گئے ہیں۔ ان کے تذکرے کے بغیر نہ صرف اردو ادب بلکہ ہندی زبان کے ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ انہیں ادبی دنیا نے فطرت نگار ادیب اور شہنشاہ ناول جیسے القاب سے نوازا ہے۔

منشی پریم چند کے یہاں مشاہدہ، وسعت نظر، فطرت اور انسانی افعال کا مطالعہ، واقعیت سے قربت اور قدرتی جذبات و فطری احساسات کی عکاسی اپنے بے حد سادہ اور دل نشیں انداز بیان کے ساتھ موجود ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی زندگی اور اس کے مسائل کو ایک بچے انسان دوست اور ایک اچھے ادیب کے نقطہ نگاہ سے دیکھا تھا۔ جس طبقہ کے لوگوں کو انہوں نے پریشانی اور مظلومی کی حالت میں دیکھا اس طبقے کے لوگوں سے انہیں زیادہ ہمدردی پیدا ہو گئی اور انہوں نے ان کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھ کر قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔

اردو افسانہ نگاری کا باوا آدم خواہ کوئی بھی رہا ہو لیکن منشی پریم چند نے افسانہ نگاری کی ایک ایسی راہ پیدا کی جس پر بہت سے افسانہ نگار چلنے لگے۔ ان کے افسانوں کی کل تعداد 204 کے قریب ہے۔ اردو میں ان کا سب سے پہلا افسانہ "دنیا کا انمول رتن" ہے جو 1907ء میں شائع ہوا تھا۔ 1908ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس کی اشاعت نے انگریزی حکومت پر ایسی ضرب لگائی کہ اسے ضبط کر لیا گیا اور انہیں افسانہ لکھنے سے پہلے حکومت سے اجازت لینے کا حکم صادر کیا گیا۔ انہوں نے اس پابندی کو برداشت نہیں کیا اور دھنپت رائے (اصلی نام) اور قلمی نام (نواب رائے) کو چھوڑ کر پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا۔

پریم چند نے پورے شعور اور بصیرت کے ساتھ اپنے عہد کی زندگی کی ترجمانی کی۔ انہوں نے اس وقت کے غیر اطمینان بخش صورت کا مشاہدہ کیا۔ جہالت، معاشی بدحالی، فرقہ پرستی، چھوا چھوت، توہم پرستی اور اندھی عقیدت وغیرہ سماج میں اپنی جڑیں گہرائی تک پھیلائے ہوئی تھیں۔ پریم چند نے ماضی کو حربہ بنا کر پیش کیا جن میں بہادری، جواں مردی، ہمت اور وفاشعاری تھی۔ ان کی افسانہ نگاری کا دوسرا رخ دیہات اور دیہاتیوں کے مسائل ہیں۔ یہ مسائل مختلف شکلوں میں ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔ انہوں نے حقیقت کو اس کے حقیقی رنگ ہی میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں سماجی اور گھریلو مسائل، دونوں حقیقی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ "نمک کا داروغہ، عید گاہ،

کفن، بوڑھی کا کی، حج اکبر، بڑے گھر کی بیٹی، پوس کی رات، نجات، دو بیل" وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن کے ذریعے اس وقت کی صورت حال کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس وقت جو گھریلو اور سماجی مسائل تھے ان کی عکاسی ان افسانوں میں کی گئی ہے۔ چونکہ وہ گاؤں کے اوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لیے گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں اور وہاں کی سیدھی سادی زندگی سے جذباتی لگاؤ تھا۔ انہوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں میں خاص طور سے جگہ دی اور اس دنیا کا نقشہ کھینچا جو سب سے زیادہ حقیقی، جاندار اور سب سے زیادہ انسان دوستی کی طلب گار تھا۔ وہ اردو کے پہلے افسانہ نگار تھے جنہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا۔ انسان دوستی کے اس سفر میں ہر قدم پر وہ اپنے آپ کو بدلتے رہے۔ ان کی فن کارانہ نظر ہمیشہ زندگی کی پر پیچ وادیوں میں حقیقت اور حسن کی متلاشی رہی۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے مطابق:

> "ہر بڑا ادیب زندگی کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھتا اور اس کے ظاہر و باطن پر غور و فکر کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقت اور غایت کیا ہے اس کی تعمیر میں دیکھ اور سکھ، نیکی اور بدی کی کیا اہمیت ہے۔ کیا انسان کے دکھوں کا کوئی مداوا ممکن ہے۔ کیا اس کی زندگی اور اس کے حقائق ماورا میں بھی کوئی سچائی اور طاقت ہے۔ اگر ہے تو انسانی زندگی سے اس کا کیا تعلق ہے ..... دنیا کے عظیم فنکاروں نے اپنے اپنے طور پر اس نوع کے سوالوں کا جواب دیا ہے۔"
>
> (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر قمر رئیس، ص:390)

پریم چند کی زیادہ تر تصانیف افسانوی ادب میں جدید کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں اور کلاسیکی ادب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ جس زاویہ نظر سے اور جس زمانے اور جس دور میں اس کا مطالعہ کیا جائے گا اس کے بارے میں کچھ نئی صداقتیں، کچھ نئی حقیقتیں سامنے آئیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان کے بارے میں نئی نئی صداقتیں سامنے آرہی ہیں۔

پریم چند نے جس وقت میں افسانہ نگاری کی ابتدا کی اس دور میں خاص طور سے دو رجحانات ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک حقیقت نگاری اور دوسرا رومانیت پسندی۔ ایک رجحان کے شیدائی پریم چند تھے اور دوسرے رجحان کے رہبر و رہنما سجاد حیدر یلدرم۔ دونوں افسانہ نگار الگ الگ نقطہ نظر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ حقیقت نگاری کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے پریم چند نے عام انسانی مسائل یعنی حقیقی زندگی کو اپنے افسانے کا موضوع بنا کر اردو افسانے کی بنیاد حقیقت نگاری پر رکھی۔ اردو افسانہ نگاری میں پریم چند کے افسانوں کی اس لیے بڑی اہمیت ہے کہ انہوں نے تصور حیات کو مقصد حیات بتاتے ہوئے عوامی زندگی بالخصوص کسانوں، مزدوروں اور نچلے طبقہ کے لوگوں کے سماجی اور جذباتی مسائل کو بڑی فنکاری کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ یوں تو ابتدا میں انہوں نے بھی داستانی رنگ کو اپنایا تھا۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں رومانی طرز اور وطن پرستی کے جذبے کی کارفرمائی بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ شیخ محمود کے اس اقتباس سے ان کی حب الوطنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> "اگر امیر پر تدبیر کی تلوار لوہے کی ہے تو تمہارا تیغہ فولاد کا ہے۔ اگر اس کے سپاہی جانباز ہیں تو تمہارے سپاہی بھی سرفروش ہیں۔ ہاتھوں میں تیغ مضبوط پکڑو اور نام خدا لے کر دشمن پر ٹوٹ

پڑو۔ تمہارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میدان تمہارا ہے۔"

پریم چند کے افسانوں میں فکر و فن گھل مل کر حقیقت کے پیمانے میں اس طرح ڈھل گئے ہیں کہ انہیں الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد محض قصہ گوئی پر نہیں رکھی بلکہ نفسیاتی پہلو بھی ان کی نگاہ میں رہتا تھا۔ ان کے یہاں حقیقت پسندی صرف ایسی نہیں ہے جیسی کہ زندگی کو ہو بہو پیش کر دیا جائے بلکہ انہوں نے کرداروں کا جائزہ لیتے وقت نفسیات کو بھی اہمیت دی ہے۔ انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے۔

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض کسی واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا ہوں۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی بنیادیں نہیں ملتیں میرا قلم اٹھتا ہی نہیں۔ زمین تیار ہو جانے پر کیرکٹر کی تخلیق کرتا ہوں۔"

(پریم چند کی زندگی اور تصنیفات پر ایک نظر، علی جواد زیدی مشمولہ منشی پریم چند شخصیت اور کارنامہ، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، ص 111)

پریم چند نے اپنے ابتدائی افسانوں میں حب الوطنی اور وطن پرستی کے جذبے کو بروئے کار لاتے ہوئے ہندوؤں کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ زندہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور قاری پر نفسیاتی طور پر یہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ وہ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ انہوں نے غور و فکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ صرف غلامی ہی وہ واحد لعنت نہیں ہے جس سے نجات پا کر پوری قوم اپنا مقصد حاصل کرے۔ اس کے سارے دکھ اور درد کا مداوا ہو جائے بلکہ غلامی سے بڑھ کر بھی چند لعنتیں انہیں نظر آئیں۔ وہ لعنتیں تھیں خودداری، عزت نفس اور جذبہ ایثار کی کمی۔ پریم چند انہیں دیکھ کر اندر ہی اندر پریشان تھے۔ انہوں نے سوچا کہ ماضی کی عظمتوں کو دوبارہ قائم کر کے ان کمیوں کو دور کیا جا سکتا ہے اور ایک اچھے قوم کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس خصوصیت کو اجاگر کرنے کے لیے انہوں نے کئی اچھے افسانے لکھے۔ ایک افسانہ "رانی سارندھا" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"تم میرے رتن سنگھ نہیں، میرا رتن سنگھ سچا سورما تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے اس لکھے جسم کو بچانے کے لیے اپنے چھتری دھرم کو ترک نہ کر سکتا تھا۔ رتن سنگھ کو بدنام مت کرو۔ وہ بہادر راجپوت تھا۔ میدان جنگ سے بھاگنے والا بزدل نہیں۔"

پریم چند نے اس موضوع پر وکرمادتیہ کا تیغہ راجہ مہرول، مریادا کی قربان گاہ، سرپر غرور اور رانی سارندھا وغیرہ کئی اچھے افسانے لکھے جن کا اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام ہے اور اردو افسانہ نگاری میں ان افسانوں کی بہت اہمیت ہے۔

پریم چند کے دیہی زندگی سے متعلق افسانے کئی لحاظ سے اہم اور قابل توجہ ہیں۔ وہ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے گاؤں کے حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے مسائل سے اچھی طرح واقف تھے۔ زمیندارانہ نظام، دبے کچلے مزدور اور کسان، سسکتے ہوئے فاقہ کش ہریجن، ذات پات کی تفریق، اندھی عقیدت میں گھری عورتیں اور مرد۔ تمام حالات پریم چند کے سامنے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات پر بہت سے افسانے لکھے اور قاری کو دیہی لوگوں کے مسائل سے آگاہ کراتے رہے۔ دیہی عوام جو سالہاسال سے قرض، بیگار، سود، اندھی عقیدت، غلط رسم ورواج اور مذہبی نابرابری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، جو زندگی کی کسی خوشی میں شریک نہیں تھے۔ ان کے مسائل پر پریم چند نے قلم اٹھایا۔ ان کی دبی دبی آواز کو قاری کے سامنے لانے کی جرات مندانہ کوششیں کیں۔

پریم چند نے اپنے دور کے مسائل اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں دیہی معاشرے اور ماحول کی عکاسی اس فطری انداز سے کی گئی ہے کہ اس وقت کا دیہی معاشرہ اور ماحول آج بھی قارئین کی نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ گاؤں میں رہنے والے کسان، مزدور اور متوسط طبقہ کے لوگوں کے استحصال کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کی پوری عکاسی ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ عورتوں کے مسائل، کمزور لوگوں کے مسائل، بیوہ کے مسائل اور ہریجنوں کے مسائل اس وقت کے ہندوستانی معاشرے میں اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ ان مسائل سے نکلنا دشوار ہی نہیں محال تھا۔ پریم چند نے اپنے معاشرے کو دیکھا اور پرکھا تھا اس لیے انہوں نے اپنے معاشرے اور ماحول میں پھیلے ہوئے ان مسائل کو اپنے افسانوں کے ذریعے منظر عام پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

پریم چند کے یہاں شروع ہی سے سماجی حالات کی عکاسی اور اس دور کے معاشرے اور ماحول کی عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے شہری اور دیہاتی دونوں جگہوں کی زندگیوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ خاص طور سے دیہات میں رہنے والے محنت کشوں کے دکھ درد کو اپنے افسانوں میں پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابتدا سے آخری دور تک انہوں نے سماج کے دبے کچلے، بے کس اور بے بس لوگوں کے احساسات و جذبات کی ہو بہو ترجمانی کی ہے۔ وقار عظیم کہتے ہیں:

> "پریم چند کے کئی افسانے دیہاتی زندگی کے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں پہلی مرتبہ اردو میں ہمارے سماج کے بعض کردار کو ہمارے سامنے اس طرح جیتا جاگتا لا کھڑا کر دیا ہے کہ ہم ان کی صورت شکل اور انداز کے علاوہ ان کی نفسیات، ان کے جذبات اور ان کے دل کی گہرائیوں کے راز دار بن گئے ہیں۔ زمیندار، پٹواری، پولیس کا سپاہی، داروغہ مختار، کسان اس کی بیوی بچے سب سے ہمارا ایسا تعارف ہے کہ ہم انہیں کہیں دیکھیں بغیر کسی دقت کے پہچان لیں گے۔"
>
> (نیا افسانہ۔ وقار عظیم ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1996ء ص:19)

پریم چند نے دیہاتیوں کی ابتر زندگی دیکھی تھی۔ قوم و ملک کے حالات بھی ان کے سامنے تھے۔ انہوں نے دیہی معاشرے اور ماحول میں رہنے والے لوگوں کی ابتر زندگی کا صحیح نقشہ کھینچتے ہوئے ان کی بدتر زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہوئے ان کی بدتر زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ وہ سوچتے تھے کہ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ ان کے دکھ درد سے ان کے مسائل سے ان کی پریشانیوں سے دوسرے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ ان کے مسائل کو پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پڑھے لکھے لوگوں نے ان کے افسانے پڑھ کر دیہی زندگی کو اپنے ملک کی زندگی کا ایک حصہ سمجھنا شروع کیا اور اسی احساس نے آہستہ آہستہ دیہی زندگی اور یہاں کے چھوٹے بڑے مسائل کو سیاسی ادراک کی بنیاد بنایا جس کی وجہ سے قومی اور سیاسی تحریکوں کا تار دیہات اور اس کی زندگی سے بندھ گیا۔

کسانوں کے بارے میں پریم چند کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ یہی فطرت کے مزاج داں ہیں، موسم کے مزاج کو پہچاننے والے، زمین کو زرخیز بنا کر ان سے فصل اگانے والے، لوگوں کا پیٹ بھرنے والے۔ اس لیے انہوں نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں انہیں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ دوسرے کوئی لوگوں نے کسانوں کی بدحالی اور بدتر زندگی کو افسانوں کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی پریم چند کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پریم چند نے کسانوں کی زبوں حالی کو اپنے افسانوں میں جس متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے یہ ان کی ایک بڑی خوبی ہے اس سلسلے میں سلام سندیلوی فرماتے ہیں:

"انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے لیے کسانوں کی بیداری ضروری ہے۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ زمیندار، تحصلیدار، پٹواری، پیادے، چوکیدار، جج، وکیل اور ڈاکٹر وغیرہ کسانوں کے دشمن ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سرمایہ دار طبقے کو کسانوں کا زبردست دشمن تصور کرتے تھے۔"

(ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص:331)

پریم چند کے افسانوں کی خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہ صرف کسانوں کے مسائل سے لوگوں کو آگاہ کیا بلکہ زمینداروں کے ذریعے کیے جانے والے استحصال اور مذہبی ٹھیکیداروں کے رعب و دبدبہ کو بھی مؤثر انداز سے پیش کیا ہے۔ زمیندار کسانوں سے جبراً لگان وصول کرتے تھے۔ کسان قرض کے بوجھ میں دبا ہوا ہو یا کھیت میں فصل نہیں ہوئی ہو اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ ہر حال میں اپنے کارندوں کے ذریعے لگان وصول کیا کرتے اور اگر کسان لگان نہیں دے پاتا تو انہیں اپنی زمین سے بے دخل ہونا پڑتا تھا۔ اس طرح مذہبی ٹھیکداروں کا عام لوگوں پر ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ وہ ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ عام طور پر یہ برہمن ہوتے تھے جو سارے مذہبی رسوم کی ادائیگی کرتے تھے۔ ان کا یہ سلسلہ موروثی ہوا کرتا تھا:

"دنیا اس کی تعظیم اور خدمت کرے۔ اور کیوں نہ چاہے جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیوتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں گویا انہوں نے خود پیدا کی ہو تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا۔ پہچا اس کا ترکہ ہے۔" (معصوم بچہ)

معصوم بچہ نجات، دودھ کی قیمت اور سوا سیر گیہوں وغیرہ میں پریم چند نے زمینداروں، مذہبی ٹھیکیداروں اور مہاجنوں کے ذریعہ کئے جانے والے استحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ پسماندہ افردان کے استحصالی شکنجے میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ وہ پنڈتوں، زمینداروں اور مہاجنوں کے ہر ظلم و ستم کو برداشت کر رہے تھے۔ وہ اپنے اس استحصال کو اپنی قسمت مانتے تھے یا اپنے پچھلے جنم کے کیے کا بھوگ ماننے لگے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے مطابق:

"یہ لوگ انہیں ہمیشہ سے ہندو دھرم کا محافظ سمجھتے آئے ہیں اس لیے وہ ان کی عزت کرتے اور ان کی بزرگی اور جلال سے خوف زدہ رہتے۔ انہیں خوش کر کے اور دان دکشا دے کر وہ سمجھتے کہ دیوتاؤں کو منالیا۔" (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ص:425)

اردو افسانہ نگاری میں پریم چند کے افسانوں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ انہوں نے ہریجنوں کی نہایت ہی خستہ حالت اور خواتین کی سماجی حیثیت کو اس متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے کہ آج بھی ان افسانوں کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ اچھوتوں اور شودروں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا اسے پریم چند نے اس فطری انداز سے پیش کیا ہے کہ آج بھی ان افسانوں کو پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ دودھ کی قیمت اور صرف ایک آواز وغیرہ ان کے ایسے افسانے ہیں جو آج بھی توجہ کے قابل ہیں۔ دودھ کی قیمت میں گاؤں کے زمیندار ہیش ٹھاکر ناتھ کے یہاں بچہ تولد ہوتا ہے تو اس کی پرورش کی ساری ذمہ داری بھونگی کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ بھونگی اپنے لڑکے منگل کو دودھ پلانے کے بجائے ٹھاکر کے لڑکے سریش کو دودھ پلاتی ہے لیکن ایک سال کے بعد ہی بچے کا دودھ اس لیے چھڑا دیا جاتا ہے کہ کہیں بچہ اپنا دھرم نہ نشٹ کر لے۔

ہریجنوں کے لیے آبادی سے دوران کی بستیاں ہوتی تھیں، ان کا الگ کنواں ہوتا تھا۔ وہ لوگ انسانی حقوق سے محروم ہوا کرتے تھے۔ جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ نہ مذہبی کتابوں کو چھو سکتے تھے، نہ مندروں میں جاسکتے تھے اور نہ اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی اپنی زمین تھی نہ اپنی رہائش۔ سارا دن بیگار کرتے۔ ذات پات کی اس تفریق کو پریم چند نے "صرف ایک آواز" میں اس طرح اٹھایا ہے:

> "جن لوگوں کے سائے سے ہم پرہیز کرتے آئے ہیں، جنہیں ہم نے حیوانوں سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے۔ ان سے گلے ملنے میں ہم کو ایثار، ہمت اور بے نفسی سے کام لینا پڑے گا۔ اس ایثار سے جو کرشن میں تھا۔ اس ایثار سے جو رام میں تھا۔۔۔ ہم مضبوط دل سے عہد کریں کہ آج سے ہم اچھوتوں کے ساتھ برادارانہ سلوک کریں گے ان کے تقریبوں میں شریک ہوں گے اور اپنی تقریبونی میں انہیں بلائیں گے۔"

ہریجنوں کی طرح اس وقت دیہی معاشرے اور ماحول میں عورتوں کے بے شمار مسائل تھے جو پورے معاشرے میں تلخی اور بے چینی پیدا کر رہے تھے۔ ہندو بیواؤں کی حالت بے حد سنگین تھی۔ ان کے بال کٹوا دئے جاتے تھے۔ اچھے کپڑے، مناسب غذا اور زیورات سے محوم کر دیا جاتا تھا۔ توہم پرستی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ انہیں منحوس اور ابھاگن سمجھا جاتا تھا۔ کسی تقریب، شادی بیاہ اور خوشی کے موقع پر انہیں دیکھ لینا بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بیوا ہی نہیں شادی شدہ عورتوں کے ساتھ ساتھ ضعیف عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے بھی بہت سے مسائل تھے۔ پریم چند نے عورت کو اونچا مقام دلانے کی کوشش کی :

> "عورت محض کھانا پکانے، بچے جننے، شوہر کی خدمت کرنے اور ایکادشی کا برت رکھنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی، ذہنی، عملی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔"

عورتوں کی حالت زار کو پریم چند نے اپنے افسانے "ابھاگن" اور "بدنصیب ماں" میں پوری سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان میں "ابھاگن" ایک ایسا افسانہ ہے جسے پڑھ کر قارئین دیر تک حیرت و استعجاب میں ڈوبے رہتے ہیں۔ مرجادا ایک ایسی سہاگن عورت ہے جو میلہ

کے ہنگامے میں کھو جاتی ہے۔ جب وہ گھر واپس آتی ہے تو اس کا شوہر اسے اپنی زوجیت سے علاحدہ کر دیتا ہے۔

"تمہاری کسی مرد کے ساتھ ایک لمحہ بھی تخلیہ میں رہنا تمہاری عصمت میں داغ لگانے کو کافی ہے ... مرجادا دو تین منٹ سکتہ کے عالم میں کھڑی رہی جیسے اسے شبہ ہو رہا ہو کہ یہ وہی گھر ہے، یہ وہی میرا شوہر ہے، یہ وہی میرا لڑکا ہے یا کوئی خواب ہے .... دفعتاً اس نے آپ ہی کہا، تو جانے دو... بچے کو بھی نہ دیکھوں گی۔ سمجھ لوں گی کہ میں بیوہ بھی ہوں اور بانجھ بھی۔"

پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے میں دبی کچلی عورتوں کے حالات بدلنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت ہر رنگ میں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے ذہن و جنسی مسائل اور طوائفوں کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں کے ذریعہ اٹھایا ہے کیونکہ اس وقت دیہی معاشرے میں ایسے مسائل عام تھے۔ انہوں نے اپنے افسانہ "مالکن، نئی بیوی، مزار الفت خودی، حسن وشباب ابھاگن، دیشیا اور گھاس والی میں عورتوں کے مسائل کو اٹھایا ہے۔ انہیں رسوائی اور ذلت کے غار سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ "مالکن" کی رام پیاری بیوہ ہو جاتی ہے اس کا سر اسے گھر کا گار جین بنا دیتا ہے۔ وہ نہیں کر گھر کے لوگوں کے لعن طعن برداشت کر لیتی ہے:

"وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا تو یہ فرض ہے کہ سب کی دھونس برداشت کرے اور کرے وہی جس میں گھر کی بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہ داری کے احساس پر طنز و طعن اور دھمکی کسی چیز پر اثر انداز نہ ہوتا۔ ان کا مالکانہ احساس ان جملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا تمہیں برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے۔ کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی۔ مگر وہ خوش تھی۔ مالک ہونے کا احساس ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔"

"نئی بیوی" میں مصنف نے دکھایا ہے کہ سیٹھ جی اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دولت کے سہارے کس طرح ایک کم عمر لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں جبکہ ان دونوں کے درمیان نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اختلاف بھی ہے۔ پریم چند نے دیہی ماحول کی ایک بھیانک تصویر اس افسانے میں پیش کی ہے۔ غلط رواجوں، رسموں، روایتوں اور اندھی عقیدت کی وجہ سے معاشرے میں گندگی اور بدکرداری پھیلی ہوئی تھی۔ اس افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ لالہ ڈنکامل دولت حاصل کرنے اور مجرا سننے کی چاہ میں اپنی بیوی سے اس طرح بے پرواہ ہو جاتا ہے کہ وہ گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہے۔ دوسری کمسن لڑکی آشا سے شادی کے بعد وہ اس سے اپنائیت کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن بے میں شادی کی وجہ سے رفتہ رفتہ وہ اپنے نوکر جنگل کے قریب ہو جاتی ہے۔

مذکورہ دونوں افسانوں میں جذباتی زندگی ایک ہی انداز سے پیش ہوئی ہے۔ دونوں افسانوں میں تیسری شخصیت سے انسانی نفسیات کی گرہیں کھلتی ہیں۔ "مالکن" کا یہ اقتباس دیکھیں:

"میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہاری طرح ہو۔ ایسی ہی لجانے والی ہو، ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو۔ ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو... ایسی ہی ہنس مکھ ہو۔ بس ایسی صورت ملے گی تو بیاہ کروں گا نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔ پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا پیچھے ہٹ کر بولی تم بڑے دل لگی باز ہو۔"

ایک اور افسانہ "نئی بیوی" سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

"بیوی جس کام کے لیے ہے اس کے لیے ہے۔ آخر بیوی کس کام کے لیے؟ آپ مالک ہیں نہیں تو بتلا دیتا بیوی کسی کام کے لیے ہے۔... نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل کھسک کر کندھے پر آگیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔ لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے تم ذرا آجانا۔"

دونوں افسانوں میں عورت کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ دونوں میں نوکر کے ذریعہ عورت کی جنسی خواہشات کی تکمیل کے اشارے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی افسانوں میں پریم چند نے عورتوں کی مجھے زندگی کا تجزیہ کیا ہے۔ انہیں اوپر اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ عورت جو شرافت، ایثار اور قربانی کا مجموعہ قرار دی جاتی ہے جس کے رگ وپے میں محبت کا جذبہ موجزن رہتا ہے اس کے باوجود اسے ناقص العقل دو دھاری تلوار، زہریلی ناگن اور فتنہ وفساد کی جڑ جیسے بہت سے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جس عورت نے اپنے بطن سے ایک سے بڑھ کر ایک دانشور فلسفی، سائنٹسٹ اور عالم دین جیسی نادر ہستیوں کو پیدا کیا ہے اسے مرد کی محکومیت ملی۔ اسے دان اور خیرات کی چیز سمجھا گیا ہتی کے نام پر اسے زندہ جلایا گیا مگر اس نے صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ اپنے مجازی خدا کی خدمت کرتی رہی، اس کی سلامتی اور لمبی عمر کی دعا مانگتی رہی لیکن ہمیشہ اسے شک کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ شوہر کی نظر پھرتے یا بیوہ ہوتے ہی اسے گدھ کی طرح نوچا جانے لگا۔ پریم چند نے جب اپنے معاشرے اور ماحول میں یہ سب کچھ دیکھا تو بے حد دکھی ہوئے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورتوں کے مرتبہ کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ اسے معاشرہ میں اونچا مقام دلانا چاہا اس کے بارے میں مثبت انداز سے سوچا۔ "زاد راہ" کی سوشیلا کی زبان سے اس طرح کے جملے ادا کروائے:

"یہ پچاس سال کی کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس..... یہ احمق سمجھتا ہے کہ لالچ میں آکر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے میں باندھ دوں.... نام کے لیے ساری جائیداد کھوئی، زیور کھوئے، مکان کھویا لیکن لڑکی کو کنوئیں میں نہیں ڈال سکتی۔"

کم عمر لڑکی کی شادی عمر دراز مرد سے کرنے کے خلاف انہوں نے اس طرح کی دوسری کئی اور کہانیاں لکھیں۔ جس طرح وہ کم عمری کی شادی کے خلاف تھے اس طرح بیوہ کی شادی کے طرف دار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جوان بیوہ کے لیے زندگی کا لمبا سفر طے کرنا بہت مشکل ہے۔ نفسیاتی خواہش کبھی بھی بہکا سکتی ہے۔ ایک طرف انہوں نے اپنے افسانہ "مجبوری" میں یہ کہا:

"کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ بیواؤں سے استانیوں کا کام لینا چاہئے۔ منشا تو صرف یہی ہے کہ لڑکی کا دل کسی کام میں لگا رہے۔ کسی سہارے کے بغیر بھٹک جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمگادڑ بسیرا لیتے ہیں۔"

تو دوسری طرف مالکن میں قوم کے ضمیر کو بیدار کرتے ہیں۔ دو بچوں کی ماں جو بیوہ تھی حالات سے تنگ آکر اپنے دیور سے شادی کر لیتی ہے تو اس کی زندگی میں ایک نئی بہار آجاتی ہے۔ اس خوشگوار پہلو کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"بیوگی کے غم میں مرجھائی ہوئی مالیا کا زرد چہرہ کنول کی طرح سرخ ہو گیا۔ دس سال میں جو کچھ کھویا
تھا وہ ایک لمحہ میں سود کے ساتھ مل گیا۔ وہی تازگی وہی شگفتگی، وہی ملاحت اور وہی دلکشی۔۔۔"

پریم چند نے دیہی معاشرے میں مشترک خاندان کے رواج کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی مشترک خاندان کے ایک فرد تھے اس لیے اس کی خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اس وقت زیادہ کارگر تھا جب لوگ کھیتی باری پر منحصر کرتے تھے۔ صنعتی انقلاب کے بعد مشترک خاندان کی اہمیت وافادیت باقی نہیں رہ گئی تھی جہاں ایک طرف اس کے ذریعہ رشتوں کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ محبت واخوت اور صبر و تحمل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بھائی چارگی کا جذبہ پیدا کرایا جاتا تھا مل جل کر اور مل بانٹ کر زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا جاتا تھا وہیں دوسری طرف بدلتے ہوئے حالات کے تحت مشترک خاندان میں اکتاہٹ، انتشار شکوہ شکایات، گھریلو جھگڑے، خلفشار اور بدنظمی پیدا ہوتی جارہی تھی۔ پریم چند نے قدیم وجدید نظریات کی شکست وریخت کی عکاسی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ کہیں انہوں نے مشترک خاندان میں ہونے والے جھگڑوں کے خلاف تو کہیں گھریلو بدنظمی پر آواز کسی ہے۔ "بانگ سحر" سے یہ اقتباس دیکھیں"

"غضب خدا کا ہمارے بچے اور ہم لنگوٹی کو ترسیں، گاڑھے کا ایک کرتا بھی ہوتا تو دل کو تسکین
ہوتی اور ساری دوکان اسی شہدے کا کفن بن گئی ... میں صبح سے شام تک بیل کی طرح پسینہ
بہاؤں، مجھے نین سکھ کا کرتا بھی میسر نہ ہو اور یہ پانچ دن بھر چارپائی توڑے... اب ہم میں نہ اتنا
ہوتا ہے اور نہ اتنی ہمت، ہم اپنی جھونپڑی الگ بنائیں گے ہاں جو کچھ ہمارا ہو ہم کو ملنا چاہئے۔"

بڑے گھر کی بیٹی، بانگ سحر اور علاحدگی وغیرہ میں منشی پریم چند نے مشترک خاندان میں ہونے والی ذہنی کشمکش کی عکاسی بالکل فطری انداز میں کی ہے۔ ان کے اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں (بڑے گھر کی بیٹی) کو پڑھ کر مشترک خاندان کی گھریلو زندگی کا نقشہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے:

"میں لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔ روپیہ پیسہ کا مجھے کچھ حساب نہیں ملتا، نہ جانے تم کیا لاتے ہو اور وہ
(بیوہ ساس) کیا کرتی ہے۔ تم اپنی ماں اور بھائی بہنوں کے لیے جیو میں کیوں مروں. تم دنیا کو لے
کر رہو میرا اب اس کے ساتھ نباہ نہ ہو گا۔"

مختصر یہ کہ پریم چند ایک ایسے افسانہ نگار تھے جنہوں نے عام لوگوں کی زندگی کے مسائل جو دیہی معاشرے اور ماحول میں پھیلے ہوئے تھے کی سچی عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانے سماج کے دبے کچلے طبقے کی زندگی کے نمونے ہیں۔ ابتدائی دور سے آخر وقت تک وہ دیہات اور گاؤں کی -پگڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ کھیت اور کھلیان کے مناظر دیکھنے اور دکھاتے رہے۔ غریب، نادار، پس ماندہ اور ہریجنوں کے دکھ درد کی عکاسی کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک دیہی ماحول اور معاشرے کی تصویر نہیں بدلے گی تب تک وہاں کے لوگوں کی حالت نہیں سدھرے گی اور جب تک وہاں کے لوگوں کی حالت بہتر نہیں ہو گی تب تک ہمارا سماج، ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکے گا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ منشی پریم چند نے دیہی معاشرے اور ماحول کی عکاسی جس وسعت قلبی، کھلے ذہن اور جس فنکاری سے کی ہے اسے نہ ہندوستان کے لوگ بھلا سکتے ہیں اور نہ افسانہ نگاری کی تاریخ۔ اس عظیم کارنامے کے لیے اردو ادب ہمیشہ انہیں خراج تحسین پیش کرتا رہے گا۔

5.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبا نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- پریم چند نے افسانہ نگاری کا آغاز اپنے فرضی نام نواب رائے سے 1907 میں کیا۔ان کی پہلی کہانی "روٹھی رانی" رسالہ "زمانہ" کانپور میں قسط وار شائع ہوئی، لیکن یہ کہانی طبع زاد نہیں ہے۔
- پریم چند کی پہلی طبع زاد کہانی "عشق دنیا اور حب وطن" 1908 میں شائع ہوئی۔یہ کہانی ان کے افسانوی مجموعہ "سوز وطن" میں شامل ہے۔1910 میں اس مجموعے پر سرکار نے پابندی لگادی۔
- 1910 تک پریم چند نے جو کہانیاں لکھیں وہ مختصر بیانیہ قصوں سے لبریز ہیں، لیکن اسی سال ان کے دو افسانے "بے غرض محسن" اور "بڑے گھر کی بیٹی" شائع ہوئے جنہیں ان کی افسانہ نگاری کا نقطہ عروج کہا جاتا ہے۔
- پریم چند کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور 1918 سے 1930 کو محیط ہے۔یہی روز میں مزدوروں کی عوامی تحریک کا زمانہ بھی ہے۔اس دور کے افسانوں میں سوانحی عنصر نمایاں ہے۔سوتیلی ماں، گلی ڈنڈا، شطرنج کی بازی، عید گاہ، پوس کی رات، سوا سیر گیہوں، راہِ نجات وغیرہ اس دور کی بہترین کہانیاں شمار کی جاتی ہیں۔
- پریم چند کی افسانہ نگاری کا تیسرا دور 1931 سے شروع ہو کر ان کی آخری سانس تک چلتا رہا۔اس دور میں ان کا فن اپنی پختگی کی معراج پر تھا۔
- پریم چند کے افسانوں میں ہمیں دیہات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ان سے پہلے ہمارے قصے کہانیوں میں گاؤں کا تذکرہ نہیں ملتا تھا۔پریم چند نے گاؤں کے کسانوں اور ان کا خون چوسنے والے مہاجنوں اور پروہتوں کو اپنے افسانوں میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔
- حقیقت نگاری پریم چند کی کہانیوں کا سب سے بڑا وصف ہے۔انہوں نے زندگی کو جیسا دیکھا، اسی طرح پیش کر دیا۔
- وہ سماجی انصاف کے قائل تھے اور سماج میں ہونے والی نابرابری اور ناانصافی انہیں ناگوار گزرتی تھی، اس لیے انہوں نے افسانوں کے ذریعے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔
- فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور انسان دوستی ان کے افسانوں میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔

5.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مستند	معتبر، بھروسہ کے قابل	متوسط	درمیانہ، نہ بڑا نہ چھوٹا
مشاہدہ	دیکھنا، غور سے دیکھنے کا عمل	ابتر	بگڑا ہوا، خراب حالت
وسعتِ نظر	وسیع سوچ، دور اندیشی	ادراک	سمجھ، شعور

مظلومی	ظلم سہتے ہوئے حالت، بے بسی	زبوں حالی	خراب حالت، بدحالی
ضرب	چوٹ، مار	سنگین	بہت اہم، خطرناک، سخت
پر پیچ	پیچیدہ، گنجلک	استعجاب	تعجب، حیرانی
متلاشی	تلاش کرنے والا	لعن طعن	بد دعا دینا، برا بھلا کہنا
ماورا	حدود سے باہر، دنیاوی حد سے اوپر	ناقص العقل	کم عقل، سمجھ میں کمزور
وقار	عزت، سنجیدگی	علمبردار	علم اٹھانے والا

5.5 نمونہ امتحانی سوالات

5.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ پریم چند کا اصل نام کیا تھا؟

(A) دھنپت رائے (B) رام چندر ورما

(C) نندلال شرما (D) ستیہ پال سنگھ

2۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ کون سا تھا؟

(A) سوزِ وطن (B) بازگشت

(C) نیا قانون (D) کفن

3۔ پریم چند کو کن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے؟

(A) کہانیوں کے بادشاہ (B) افسانوں کے جادوگر

(C) حقیقت نگاری کے علمبردار (D) رومانوی شاعر

4۔ پریم چند کی تحریروں کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

(A) تفریح (B) اصلاحِ معاشرہ

(C) سیاسی پروپیگنڈہ (D) مذہبی تعلیم

5۔ پریم چند کے افسانوں میں مرکزی موضوع کیا ہوتا ہے؟

(A) مذہبی عقائد (B) طبقاتی کشمکش اور سماجی انصاف

(C) تاریخی واقعات (D) خواب و خیال

6۔ پریم چند کے یہاں افسانہ نگاری میں بنیادی رجحان کیا تھا؟

(A) رومانیت (B) حقیقت نگاری

(C) تصوف (D) ترجمہ نگاری

7۔ پریم چند کے افسانوں میں سب سے زیادہ کس طبقہ کے مسائل پیش کیے گئے ہیں؟

(A) بادشاہوں کے (B) سرمایہ داروں کے

(C) متوسط اور محروم طبقہ کے (D) شاعروں اور ادیبوں کے

8۔ پریم چند کے نزدیک ہندوستان کی ترقی کا بنیادی راستہ کس طبقے کی بیداری سے وابستہ ہے؟

(A) اہل علم (B) مذہبی رہنما

(C) کسان (D) نوجوان

9۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں خواتین کے کن مسائل کو زیادہ اجاگر کیا؟

(A) فیشن (B) ملازمت

(C) بیواؤں کی زبوں حالی (D) تعلیم کا فروغ

10۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا ـــــــــــ دوران کا فن اپنی پختگی کی معراج پر تھا۔

(A) پہلا (B) دوسرا

(C) تیسرا (D) چوتھا

5.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ پریم چند کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

2۔ پریم چند کے افسانوں میں کسان اور مزدور طبقے کی عکاسی کیسے کی گئی ہے؟

3۔ پریم چند کے افسانوں میں خواتین کے کردار کا تجزیہ کیجیے۔

4۔ پریم چند کو اردو افسانے کا معمار کیوں کہا جاتا ہے؟

5۔ پریم چند کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

5.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ پریم چند کے افسانوی ادب میں سماجی حقیقت نگاری اور اصلاحی رجحان کی وضاحت کیجیے۔

2۔ پریم چند کے افسانوں میں کردار نگاری اور زبان واسلوب کی فنی خصوصیات پر مفصل نوٹ لکھیے۔

3۔ اردو افسانوی ادب کی ترقی میں پریم چند کے اثرات پر روشنی ڈالیے۔

5.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ	:	پروفیسر صغیر افراہیم
2۔	پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری	:	محمد اکبر الدین صدیقی
3۔	اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید	:	ڈاکٹر پروین اظہر
4۔	پریم چند کے افسانوں میں حقیقت کا عمل	:	ڈاکٹر واجد قریشی

5.5.1 کے جوابات:

A۔1	A۔2	C۔3	B۔4	B۔5
B۔6	C۔7	C۔8	C۔9	C۔10

اکائی6: افسانہ "عید گاہ" کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

6.0		تمہید
6.1		مقاصد
6.2		افسانہ "عید گاہ" کا تجزیاتی مطالعہ
	6.2.1	افسانہ ''عید گاہ'' کا تعارف
	6.2.2	افسانہ ''عید گاہ'' کا منتخب متن
	6.2.3	افسانہ ''عید گاہ'' کا تجزیاتی مطالعہ
6.3		اکتسابی نتائج
6.4		کلیدی الفاظ
6.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	6.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	6.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	6.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
6.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کا مطالعہ کیا۔ پریم چند اردو افسانے کے صرف موجد ہی نہیں ہیں بلکہ اردو افسانے کو اس کے تمام فکری و فنی لوازمات کے ساتھ برتنے والے پہلے افسانہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ہر طرح کے موضوعات کو قلم بند کیا ہے اور ان میں مختلف طبقے کے لوگوں کو کردار بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں امیر غریب، مزدور کسان، چھوت اچھوت، مرد عورت، بوڑھے بچے ہر طرح کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ افسانہ ''عید گاہ'' میں ایک ذہین بچے کے کردار کے حوالے سے انسان کے دکھ درد اور اس کی نفسیات کو موضوع بنایا ہے۔ لہٰذا اس اکائی میں ہم افسانہ ''عید گاہ'' کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- افسانہ ''عید گاہ'' سے واقف ہو سکیں۔
- افسانہ ''عید گاہ'' کے منتخب متن کی قرأت کر سکیں۔
- افسانہ ''عید گاہ'' کا تجزیاتی مطالعہ کر سکیں۔
- افسانہ ''عید گاہ'' کے بنیادی مقصد سے روشناس ہو سکیں۔

6.2 افسانہ ''عید گاہ'' کا تجزیاتی مطالعہ

6.2.1 افسانہ ''عید گاہ'' کا تعارف:

''عید گاہ'' منشی پریم چند کا مشہور و مقبول افسانہ ہے، جو پہلی مرتبہ دہلی سے نکلنے والے رسالے ''عصمت'' میں 1933ء کے سالنامے میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ ان کے مجموعے ''دودھ کی قیمت'' میں بھی شامل ہے پریم چند کا یہ افسانوی مجموعہ پہلی بار 1937 میں شائع ہوا تھا۔ افسانہ ''عید گاہ'' ایک سماجی افسانہ ہے۔ یہ افسانہ چوبیس گھنٹے کی مختصر مدت کو محیط ہے، جو عید کی نماز سے بارہ گھنٹے قبل شروع ہو کر عید کی نماز کے بارہ گھنٹے بعد کے واقعات کو بیان کرتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی قلیل مدت کے باوجود بسیط فکر و فہم کا حامل ہے۔ اس افسانے میں اسلامی تہذیب وثقافت اور مذہبی رسومات سے انسانوں کے مابین اتحاد اور مساوات کا درس دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ افسانہ ''عید گاہ'' غربت وافلاس میں بھی انسانی قدروں کی ایک ایسی داستان ہے، جس میں عبرت اور محبت کے لامحدود امکانات پوشیدہ ہیں۔

6.2.2 افسانہ ''عید گاہ'' کا منتخب متن:

(i)

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچے کی طرح پر تبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھ کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عید گاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑے جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں۔ اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عید گاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔

تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا، وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں لیکن عید گاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔ روزے بڑے

بوڑھوں کے لیے ہوں گے، بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے آج وہ آ گئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عید گاہ کیوں نہیں چلتے۔ انہیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سوّیوں کے لیے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں، اس کی انہیں کیا فکر؟ وہ کیا جانیں ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔

ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی سات نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا۔ سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب خوب صورت بچہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا تھا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ بیماری کیا ہے؟ کہتی کس سے؟ کون سننے والا تھا؟ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے تھے اور بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹہ سیاہ ہو گیا ہے پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابّا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گے تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن آذر اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے، اس کی ایک نگاہِ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے، تم ڈرنا نہیں امّاں! میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو؟ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا تو پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے؟

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوّیاں کون پکائے گا، بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا، کیا اس وقت سوّیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہیمن کے کپڑے سیے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے لیکن گھر میں پیسے اور نہ تھے اور گوالن کے پیسے اور چڑھ گئے تھے، دینے پڑے۔ حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے گا۔ دھوبن مہترانی اور نائن بھی تو آئیں گی۔ سب کو سیوّیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے بچّے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور حامد بھی بچّوں کے ساتھ تھا۔ سب کے سب دوڑ کر نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سرا شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچّے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو خوب الّو بنایا۔

(ii)

نماز ختم ہو گئی ہے لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دُکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے بھی ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے۔ کبھی زمین پر گرتے ہیں۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی منجوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن دونوں ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ آذر اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صَرف کر سکتا۔ محسن کا باپ بار بار اسے چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا ہے۔ حامد سوچتا ہے، کیوں کسی کا احسان لوں؟ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ران سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے۔ خاکی وردی اور پگڑی لال، کندھے پر بندوق، معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آ رہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسی ہے، کتنا بشاش چہرہ ہے، شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے، سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا؟ نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا، کس مصرف کے ہیں؟

محسن کہتا ہے، ”میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح شام۔“

نوری بولی، ”اور میرا وکیل روز مقدمے لڑے گا اور روز روپے لائے گا۔“

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی کے ہی تو ہیں، گریں تو چکنا چور ہو جائیں، لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انہیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے، طرح طرح کی ضروری چیزیں، ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔ گیند، سیٹیاں، بگل، بھنورے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے محمود گیند، نوری ربڑ کا بت جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک بانسری۔ اسے وہ بجا بجا کر گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کا رفیق کوئی چیز خرید لیتا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لیے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بے چارہ یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں، کسی نے گلاب جامن، کسی نے سوہن حلوہ۔ مزے سے کھا رہے

ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں، کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا، ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں۔''

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منھ میں رکھ لیں۔ محمود اور نوری اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانہ ہو گیا۔ محسن نے کہا، ''اچھا اب ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ۔ اللہ قسم۔''

حامد نے کہا، ''رکھیے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

سمیع بولا، ''تین ہی پیسے تو ہیں، کیا کیا لو گے؟''

محمود بولا، ''تم اس سے مت بولو، حامد میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو''

حامد، ''مٹھائی کون سی بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔''

محسن، ''لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھالیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے؟''

محمود، ''اس کی ہوشیاری میں سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے، تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا۔''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دُکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خرید لے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہیں جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ۔ مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے پھر تو انہیں کوئی آنکھ اٹھا کر کبھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عید گاہ نہیں جا سکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔

دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے۔ روٹیاں توے سے اتار لو، چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو فرصت کہاں ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھو لاؤ۔ اب اگر یہاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں، آپ ہی منہ سڑے گا، پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی زبان چٹوری ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔

میری زبان کیوں خراب ہو گی۔ اس نے پھر سوچا، اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی۔ میرا بیٹا اپنی ماں کے لیے دست پناہ لایا ہے، ہزاروں دُعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان

لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں۔ جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں، مٹھائیاں کھائیں میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لوگے؟ ایک ایک کو ایک ٹوکری دوں اور دکھادوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوادوں گا اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں تو چڑا چڑا کر کھانے لگیں۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دُکاندار سے پوچھا، ''یہ دست پناہ بیچو گے؟'' دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا، ''وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔''

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں''

''تو بتلاتے کیوں نہیں؟ کے پیسے کا دو گے؟''

''چھ پیسے لگے لگا۔''

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا، تین پیسے لوگے؟ اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھرکیاں نہ سنے، مگر دکاندار نے گھرکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھادیا اور پیسے لے لیے۔ حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔ محسن نے ہنستے ہوئے کہا، ''یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کروگے؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا، ''ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرادو، ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچو کی''

محمود، ''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد، ''کھلونا کیوں نہیں ہے؟ ابھی کندھے پر رکھا، بندوق ہو گیا ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں، اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ۔''

سمیع متاثر ہو کر بولا، ''میری خنجری سے بدلوگے؟ دو آنے کی ہے''

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا، ''میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی، ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا رہے گا۔''

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا تھا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے، حامد ہے بڑا ہوشیار۔

اب دو فریق ہو گئے، محمود، محسن اور نوری ایک طرف۔ حامد یکہ و تنہا دوسری طرف۔ سمیع غیر جانبدار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس

کی طرف ہو جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحادِ ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے، حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی ربڑ اور لکڑی کی چیزیں دوسری جانب اکیلا لوہا۔ جو اس وقت اپنے آپ کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹکی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر یہ رستمِ ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا، ''اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔'' حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا، ''کہ یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ پلائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر لو۔''

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی، ''بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولیے جناب!''

حامد کے پاس اس وار کا دفیعہ اتنا آسان نہ تھا، دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا، ''اسے پکڑنے کون آئے گا؟''

محمود نے کہا، ''یہ سپاہی بندوق والا'' حامد نے منھ چڑا کر کہا ''یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑ لیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی۔ طپکڑیں گے کیا بے چارے'' محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا، ''تمہارے دست پناہ کا منھ روز آگ میں جلا کرے گا۔'' حامد کے پاس جواب تیار تھا، ''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔''

6.2.3 افسانہ ''عید گاہ'' کا تجزیاتی مطالعہ:

''عید گاہ'' منشی پریم چند کا ایک مشہور افسانہ ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں پریم چند نے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے ایک ذہین بچے ''حامد'' کی ذہانت کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اس افسانے میں دکھایا ہے کہ رمضان کے پورے تیس روزے گزر جانے کے بعد عید آئی تھی اور چاروں طرف چہل پہل تھی۔ ہر گھر میں طرح طرح کے پکوان بن رہے تھے اور ہر کوئی عید گاہ جانے کی تیاری میں تھا۔ بچے سب سے زیادہ خوش تھے۔ بچوں کو خوب سارے پیسے دیے گئے تھے۔ بچے اپنی جیبوں سے پیسوں کو نکال کر گنتے تھے اور خوش ہو کر دوبارہ انہیں اپنی جیبوں میں رکھ لیتے تھے۔ انہیں بچوں میں ایک چار سالہ حامد بھی تھا، جس کے والدین انتقال کر چکے تھے اور اس کی پرورش اس کی دادی ''امینہ'' کر رہی تھی۔

عید کے دن حامد کی دادی اس لیے رو رہی تھی کہ اس کے گھر میں کھانے کے لیے ایک دانہ بھی نہیں تھا، لہٰذا حامد کی عید کیسے ہو گی؟ حامد کو لگا کہ دادی اس لیے رو رہی ہے کہ حامد کس کے ساتھ عید گاہ جائے گا؟ عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے حامد اپنی دادی کو تسلی دینے لگتا ہے کہ وہ گاؤں والوں کا ساتھ نہیں چھوڑے گا اور انہیں کے ساتھ واپس آ جائے گا۔ امینہ نے کپڑے سی کر آٹھ پیسے جمع کیے تھے، جن کو اس نے گوالن کو دینے کے لیے رکھا تھا، لیکن امینہ نے ان پیسوں میں سے تین پیسے حامد کو دے دیتی ہے۔ حامد سب کے ساتھ عید گاہ جاتا ہے اور نماز کی ادائیگی کے بعد سب میلے کی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ سبھی بچے کھلونوں اور مٹھائیوں کی دکانوں کی طرف بڑھنے لگتے

ہیں، لیکن حامد وہیں کھڑا رہتا ہے۔ وہ کھلونے یا کھانے کی چیز خرید کر اپنے پیسوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میلے میں حامد کے ساتھ آئے ہوئے بچے طرح طرح کی چیزیں خرید رہے تھے۔ محمود نے خاکی وردی اور لال پگڑی والا سپاہی خریدا، محسن کو جھکی کمر اور پشت پر مشک والا بہشتی پسند آیا، نورنے وکیل کا مجسمہ خریدا اور سمیع نے دھوبن خریدی۔ حامد نے بھی اسی طرح کا کوئی سامان یا کھلونا خریدنا چاہا، لیکن اس نے سوچا کہ ہاتھ سے گر کر یہ کھلونے ٹوٹ جائیں گے اور پیسہ برباد ہو جائے گا۔ اچانک حامد کو اپنی دادی کا خیال آیا کہ توے سے روٹی اتارتے اور چولہے سے آگ نکالتے وقت ان کا ہاتھ جل جاتا ہے۔ یہی سوچ کر حامد نے جیب میں رکھے تین پیسوں سے دست پناہ خرید لیا۔

حامد کے ہاتھ میں دست پناہ دیکھ کر دوسرے بچے اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں کہ دست پناہ کا تمہیں کیا کام ہے۔ اس پر حامد دست پناہ کی خوبیاں گنانے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کو کندھے پر رکھو تو یہ بندوق بن جاتی ہے، ہاتھ میں لو تو فقیر کا چمٹا، اس سے تمہارے سارے کھلونے بھی توڑے جاسکتے ہیں۔ اس طرح حامد کا کہنا تھا کہ یہ محض دست پناہ نہیں بلکہ اس کا بہادر شیر ہے۔ دست پناہ کی اتنی ساری خوبیاں سن کر سارے بچوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سب حامد کے سامنے لاجواب ہو گئے۔

تمام بچے جب میلے سے گھر واپس آئے تو ان بچوں کے کھلونوں کا کچھ یوں انجام ہوا کہ محسن کی بہن کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا بہشتی گرا اور ٹوٹ گیا، جس پر ان دونوں کو مار بھی پڑتی ہے۔ جب کہ نور کا وکیل زمین پر تو بیٹھ نہ سکتا تھا اس لیے اس کو طاق پر بٹھانے کی کوشش کی گئی اور ساتھ میں پنکھا جھلا جانے لگا۔ اس دوران وکیل بھی زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔

اب محمود کے سپاہی کی بات ہوتی ہے۔ اس کے سپاہی کو گاؤں کا پہرے دار بنایا جاتا ہے۔ اندھیری رات میں ٹھوکر لگنے سے سپاہی بھی اپنی بندوق سمیت گر جاتا ہے اور اس کی ایک ٹانگ خراب ہو جاتی ہے۔ ان کھلونوں کے لانے پر انہیں کوئی دعائیں بھی نہ دی تھی۔ جب کہ حامد کی دادی امینہ نے جب دست پناہ دیکھا تو انہوں نے حامد کو ڈانٹا کہ کچھ کھایا پیا نہیں اور یہ بیکار کا چمٹا اٹھا لایا، مگر جب حامد نے دادی کو بتایا کہ تمہاری انگلیاں توے پر روٹی پکاتے وقت جل جاتی تھی۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے یہ دست پناہ لایا ہوں۔ حامد کی یہ بات سن کر دادی کا غصہ شفقت میں بدل گیا۔ حامد اس بات سے بچے سے بہت بڑا بن گیا اور امینہ خوشی سے بچوں کی طرح رونے لگی۔ افسانہ یہاں اپنے اختتام پر پہنچ جاتا ہے۔ درحقیقت افسانہ اختتام پر پہنچ کر بھی ایسی بلندی حاصل کر جاتا ہے جو قاری کے کتھارسس کا باعث ہوتا ہے۔

پریم چند نے اپنے بیشتر افسانوں میں عورت کے دکھ درد بیان کیے ہیں۔ افسانہ ''عید گاہ'' میں بھی پریم چند نے امینہ اور حامد کی ماں کا درد سمیٹا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے میں دو مختلف رویوں کی حامل عورتوں کو پیش کیا ہے۔ ایک وہ عورت جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور اس کی تڑپ میں اپنی جان دے دی۔ پریم چند نے اسے محبت کی دیوی بنا کر پیش کیا۔ دوسری امینہ بی ایک معصوم بچے حامد کے لیے اپنے شوہر، بیٹے اور بہو کی وفات سے غم گشتہ ہو کر بھی زندگی سے ہار نہیں مانا۔ وہ غم سے ہلکان تو ہوتی ہے لیکن عزم راسخ کا ایک ایسا نمونہ بن کر سامنے آتی ہیں کہ زندگی میں تمام تر مایوسی کے باوجود اس میں جینے کی چاہت نظر آتی ہے۔

پریم چند نے اس افسانے میں بچپنے کی لامحدود خوشیاں، بیوہ عورت کی زندگی کی جھلک، انسانی مساوات، ایمانداری اور

صداقت کوپیش کیا ہے۔حالات نے حامدکو زندگی کا شعور دیا۔چھوٹی عمر میں بڑی سوچ کا مالک اورغربت میں ذکی الحس بنا دیاہے۔افسانے میں حامد صداقت کا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔حامد اپنی خود اعتمادی ،قوت ارادی اورپختہ یقین کامل سے قانون کوپیٹ میں ڈال دینے کی ہمت رکھتا ہے۔

حامدایک صابر، نیک دل اور درد مند بچہ ہے۔وہ حالات سے صلح کرنے اور مستقبل سے پُرامید رہنے والا ہے۔حامد اپنے جیسے بچوں کا دکھ درد محسوس کرتا ہے۔وہ جب اپنے لیے سوچتا ہے تو وہ وہیں دوسروں کے لیے بھی فکر مند ہوتا ہے۔وہ والد کے آنے کی امید میں جو خواب بُنتا ہے۔اس خواب میں اس جیسے جانے کتنے ہی ننھے منے اپنی خوشیوں کا جشن مناتے ہوتے نظر آتے ہیں۔افسانہ ''عید گاہ'' رجائیت کی ایک بہترین مثال ہے۔

پریم چند نے افسانے میں سماج کے کئی طبقات کا جائزہ لیا ہے۔سماج میں خیر و شر کی افراط میں خیر کو فوقیت دی ہے۔اس افسانے میں خیر کا پرستار حامد حالات کے تمام تر نشیب و فراز سے بد دل نہیں ہوتا۔وہ خیر کا دامن نہیں چھوڑتا۔حالات کے بہتر ہونے کی امید میں اپنے ہم عمر کے ساتھ بھلائی کا جذبہ بھی قائم رکھتا ہے۔

افسانہ 'عید گاہ' مسلمانوں کی ایک مقدس عبادت گاہ ہے۔پریم چند نے افسانے کی مدد سے مسلمانوں کی مذہبی عقیدت اورملی اتحاد کو پیش کیا ہے۔پریم چند اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مذہبی اصول و ضوابط انسان کو کس قدر مہذب و منظم کرتے ہیں۔اتحاد ،مساوات جیسی خوبیاں انسانی فلاح و بہبودکے لیے کس درجہ ضروری ہیں۔

پریم چند نے اردو افسانے کو فنی وقار بخشا ہے۔''عید گاہ'فن کے اعتبار سے ایک اہم افسانہ ہے۔افسانہ ''عید گاہ''کا پلاٹ سادہ ہے اورسادگی کے باوجوداس میں منظم ربط پایاجاتا ہے،جو ابتدا تا آخر اپنی بلندی کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔افسانے کا اختتام ابتدائی کرب کو انتہائی صبر میں تبدیل کرکے تسکین کی لازوال جنگ میں فتح حاصل کر لیتا ہے۔

> ''رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد عید آئی۔کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔بچے کی طرح پر تبسم درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔۔۔بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔وہ رونے لگی۔دامن پھیلا کر حامد کو دعا دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندگراتی جاتی تھی۔حامد اس کا راز کیا سمجھتااور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں۔۔۔'' (افسانہ،عید گاہ)

پریم چند کے افسا نوں میں دوطرح کے کردار نظر آتے ہیں۔ایک مظلوم اور دوسرا ظالم۔مظلوم کرداروں میں معاشرے کے ستائے ہوئے عام انسان ،جن میں مرد،عورت،بچے،بزرگ اورجوان ہیں۔ظالم کرداروں میں ورنا سسٹم کے ذریعہ منقسم اعلیٰ طبقے کے لوگ شامل ہیں، جن میں پنڈت،پنڈتائین، پجاری،پجارن،ٹھاکر،ٹھاکرائین،زمیندار، مہاجن ،آسامی وغیرہ۔

افسانہ ''عید گاہ'' کا مرکزی کردار حامد ایک معصوم بچہ ہے۔دیگر اہم کرداروں میں حامد کی دادی امینہ ،حامد کے

مرحوم والدین بھی کسی نہ کسی صورت میں کردار کا روپ لیتے ہیں۔ان کے علاوہ چودھری قاسم علی ،حامد کے ساتھ عید گاہ جانے والے بچے، محسن،نوری، محمود، سمیع، آذر، فہمین کے علاوہ وکیل بہشتی جیسے کچھ بے جان کردار بھی پیش کیے ہیں۔پریم چند نے ان باحیات اور بے حیات کرداروں سے معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

پریم چند نے حامد کے کردار میں ایک معصوم بچے کی پختہ ذہنیت کو پیش کیا ہے۔حامدایک مثالی کردارہے۔وہ صابر بھی ہے اور حوصلہ مند بھی۔وقت اورحالات نے اسے وہ سب کچھ سکھا دیا جو ایک طویل عمر کے بعد بھی انسان بڑی آسانی سے نہیں سیکھ پاتا۔صبر اور اخوت تو اس درجہ کہ اپنی تمام ترخواہشات اور خوشیوں کو اپنی دادی پر قربان کر دیتا ہے۔حامد نہ صرف ایک کردار ہے بلکہ وہ پریم چند کی فکر کا جامع، پختہ اور صحت مند سماج کا عکس ہے۔

امینہ کا کردارایک بیوہ عورت کی حوصلہ مندی اور صبر و استقامت کی بہترین مثال ہے۔وہ اپنے شوہر، بیٹے اور بہو کی موت کے بعد بھی زندہ رہنے کا حوصلہ اورمصائب وآلام سے بھری زندگی کے صحرا میں یکتا شجر کی طرح کھڑے رہنے کاعزم رکھتی ہے۔غنی اس قدر کہ غربت وافلاس میں ایمان کی طرح بچاکر رکھے ایک ایک پیسے کو اپنی معصوم محبت پر قربان کر دیتی ہے اور حامد جب اس محبت کا جواب دیتا ہے تو وہ ایک ننھی سی بچی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔

حامد کے والدین اپنی وفات کے بعد بھی اپنی اولاد کی خوشیوں‌کا سہارا بنے رہتے ہیں۔آج کے معاشرے میں یہ افسانہ ایسے والدین کے لیے عبرت ہے جن کی اولادیں ان کی زندگی ہی میں محبت سے محروم رہتی ہیں۔حامداپنے بنے ہوئے خواب سے اپنی حیات کے کینوس پر رنگ بکھیرتا ہے۔چودھری قاسم علی کے کردار میں مہاجنی نظام فکرپر روشنی پڑتی ہے۔افسانے کے دیگرکرداروں میں عید گاہ جانے والے بچے، محسن،نوری، محمود، سمیع اورآذر ہیں۔پریم چند نے اپنے ان کرداروں میں فکر اطفال کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیاہے ،جن سے ان کی معصومانہ فکر عیاں ہوتی ہے۔ان کرداروں کے منطقی دلائل اور معصومانہ شرارت پر حامد کی بالادستی کا حسین امتزاج بھی دیکھاجا سکتا ہے۔

افسانہ ”عید گاہ“ میں بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیاہے۔کہانی باالترتیب رواں دواں ہے۔پریم چند اپنے افسانوں کی ابتدا ایک خاص ماحول میں کرتے ہیں۔افسانہ ”عید گاہ“ کی شروعات خوبصورت منظر کے بیان کے ساتھ ہوتی ہے:

”کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔بچے کی طرح پر تبسم درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔“ (افسانہ : عید گاہ)

پریم چند واقعات کی ترتیب میں روانی، تاثر اور تجسس کا خاص خیال رکھتے ہیں۔وہ افسانے میں تکنیک کی مدد سے دو مختلف واقعات کو باہم مربوط کر دیتے ہیں۔حامد کے چمٹا خریدنے کا واقعہ افسانے سے غیر متعلق معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم مکمل افسانہ پڑھتے ہیں تو یہ افسانے کا ناگزیر حصہ معلوم ہوتاہے۔

پریم چند نے افسانے کے اختتام پر حامد اور امینہ کے کرداروں میں تضاد پیدا کر دیاہے۔حامد ایک تجربہ کار مردبن جاتا ہے اور امینہ ایک معصوم سی گڑیا بن کر رونے لگتی ہے۔

افسانہ ''عید گاہ''کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اسم بہ مسمیٰ ہے۔عید گاہ دو لفظوں کا مرکب ہے۔عید اور گاہ۔عید کے معنی خوشی اور گاہ کے معنی جگہ۔یعنی خوشی کا مقام۔جب ہم اس کے مکمل اور وسیع تناظر پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی جگہ جہاں انسان اور انسانیت کا مجمع ہوتا ہے اور ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا نہ امیر نہ غریب ،سب ایک جیسے ہوں۔سب ایک دوسرے کے لیے باہم متحد و متفق ہوں۔سب انسان اور انسانیت میں یقین رکھنے والے ہوں۔عید گاہ میں جمع لوگوں کا یہی جذبہ عید گاہ کے حقیقی معنوں پر صادق آتا ہے۔یہاں سے واپس جانے والا ہر شخص اپنے ساتھ یہی خوشیاں لے کر جاتا ہے۔حامد بھی عید گاہ سے واپسی پر ایسی خوشی سمیٹ کر اپنی دادی کے پاس پہنچتا ہے۔بوڑھی امینہ کو اس سے پہلے کبھی ایسی خوشیاں نصیب نہ ہوئیں۔

زبان وبیان کے لحاظ سے یہ افسانہ آسان، عام فہم،سادہ و شستہ اور رواں دواں ہے۔اس افسانے میں نفیس اردو کے ساتھ دیہی عوام کی بولی کا حسین امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔مصنف نے زبان کے استعمال میں کرداروں کے طبقاتی امتیازات کا خاص خیال رکھا ہے۔پریم چند نے بچوں اور بڑوں کے کرداروں کی زبان کو بڑے منظم اور مہذب انداز میں پیش کیا ہے ،جو افسانے کو حقیقت سے قریب کر دیتا ہے۔افسانے میں پریم چند اپنے کرداروں کی زبان اور مکالموں کے بیان میں معاشرتی حیثیت کو محل نظر رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔کرداروں کی باہمی گفتگو اور مکالمے کی ادائگی میں تلفظ اور مقامی لہجے کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔اس لحاظ سے افسانہ ''عید گاہ'' پریم چند کی ایک اہم اور موثر تخلیق قرار دی جاسکتی ہے۔

6.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ''عید گاہ'' منشی پریم چند کا مشہور و مقبول افسانہ ہے،جو پہلی مرتبہ دہلی سے نکلنے والے رسالے ''عصمت '' میں 1933ء کے سالنامے میں شائع ہوا۔
- پریم چند کا یہ افسانہ ان کے مجموعے ''دودھ کی قیمت' ' میں بھی شامل ہے پریم چند کا یہ افسانوی مجموعہ پہلی بار 1937 میں شائع ہوا تھا۔
- افسانہ ''عید گاہ''عید گاہ ایک سماجی افسانہ ہے۔یہ افسانہ چوبیس گھنٹے کی مختصر مدت کو محیط ہے،جو عید کی نماز سے بارہ گھنٹے قبل شروع ہو کر عید کی نماز کے بارہ گھنٹے بعد کے واقعات کو بیان کرتا ہے۔
- ''عید گاہ''اپنی قلیل مدت کے باوجود بسیط فکر و فہم کا حامل ہے۔اس افسانے میں اسلامی تہذیب وثقافت اور مذہبی رسومات سے انسانوں کے مابین اتحاد اور مساوات کا درس دیا گیا ہے۔
- ''عید گاہ''میں پریم چند نے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے ایک ذہین بچے ''حامد''کی ذہانت کو موضوع بنایا ہے۔
- پریم چند نے اپنے بیشتر افسانوں میں عورت کے دکھ درد بیان کیے ہیں۔افسانہ ' 'عید گاہ '' میں بھی پریم چند نے امینہ

اور حامد کی ماں کا درد سمیٹا ہے۔

- افسانہ 'عید گاہ' مسلمانوں کی ایک مقدس عبادت گاہ ہے۔پریم چند نے افسانے کی مدد سے مسلمانوں کی مذہبی عقیدت اورملی اتحاد کو پیش کیا ہے۔
- پریم چند اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مذہبی اصول و ضوابط انسان کو کس قدر مہذب و منظم کرتے ہیں۔ اتحاد ،مساوات جیسی خوبیاں انسانی فلاح و بہبودکے لیے کس درجہ ضروری ہیں۔
- پریم چند نے اردو افسانے کو فنی وقار بخشا ہے۔"عید گاہ"فن کے اعتبار سے ایک اہم افسانہ ہے۔اس افسانہ "عید گاہ"کا پلاٹ سادہ ہے اورسادگی کے باوجوداس میں منظم ربط پایاجاتا ہے۔
- پریم چند نے افسانے کے اختتام پر حامد اور امینہ کے کرداروں میں تضاد پیدا کر دیاہے۔حامد ایک تجربہ کار مردبن جاتا ہے اور امینہ ایک معصوم سی گڑیا بن کر رونے لگتی ہے۔
- افسانہ "عید گاہ"کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اسم بہ مسمیٰ ہے۔عید گاہ دو لفظوں کا مرکب ہے۔عید اور گاہ۔عید کے معنی خوشی اور گاہ کے معنی جگہ۔یعنی خوشی کا مقام۔
- زبان وبیان کے لحاظ سے یہ افسانہ آسان، عام فہم،سادہ و شستہ اور رواں دواں ہے۔اس افسانے میں نفیس اردو کے ساتھ دیہی عوام کی بولی کا حسین امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔

6.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
آشنائی	:	جان پہچان،دوستی
دست پناہ	:	چمٹا
چغہ	:	ایک خاص قسم کالباس،جو علما،وکلا اساتذہ وغیرہ پہنتے ہیں۔
کمبخت	:	بدقسمت،بدنصیب
احمق	:	بے وقوف
ناطقہ	:	بولنے والا،بات چیت کرنے والا
دفینہ	:	گڑا یاچھپاہوا خزانہ،دباہوامال،چھپی ہوئی چیز
رمضان	:	عربی کا نواں مہینہ
عید گاہ	:	خوشی کامقام،خوشی کی جگہ
قارون کا خزانہ	:	بہت بڑا خزانہ

نعمت	:	مال ودولت،ثروت
ہیضہ	:	ایک مہلک بیماری
گوالن	:	گائے ، بھینس پالنے والی عورت
نگوڑی	:	بد نصیب،بد قسمت
بساط	:	سرمایہ ،پونجی
زرق برق	:	آراستہ،پیراستہ
کشش	:	کھنچاؤ
بہشتی	:	پانی بھرنے والا
مشک	:	پانی بھرنے کے لیے کھال سے بنا ہو اخول
مضروب	:	چوٹ کھایا ہوا
اچکن	:	مردانہ لباس
جرح	:	عدالت میں ایک وکیل کا جج کے سامنے مدلل بات کرنا
جَودت	:	ذہانت،ذکاوت
زاغ و زغن	:	کوّا اور چیل
خنجری	:	چھوٹی دف
سورما	:	بہادر،دلیر
فولاد	:	بہت سخت،مضبوط،اعلیٰ قسم کا لوہا
کرامت	:	عظمت ،بزرگی
منتشر	:	بکھرا ہوا،پھیلا ہوا
نفس کشی	:	نفسانی خواہشات کو کچلنے والا
جان سوزی	:	تکلیف دینا
ضبط	:	پابندی
التجا	:	منت، سماجت،درخواست

6.5 نمونۂ امتحانی سوالات

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ افسانہ ''عید گاہ'' کب شائع ہوا؟

(b) 1933 1931 (b) 1929 (c) 1927 (d)

2۔ افسانہ ''عید گاہ'' پہلی مرتبہ کس رسالے میں شائع ہوا؟

(b) زمانہ (b)نگار (c)عصمت (d)اودھ پنچ

3۔ افسانہ ''عید گاہ'' پریم چند کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل ہے؟

(b) سوزِ وطن (b)آخری واردات (c)آخری تحفہ (d)دودھ کی قیمت

4۔ افسانہ ''عید گاہ'' کا مرکزی کردار کون ہے؟

(b) حامد (b)محسن (c)نوری (d)محمود

5۔ ''عید گاہ'' کے لفظی معنی کیا ہیں؟

(b) نماز پڑھنے کی جگہ (b)جامع مسجد (c)خوشی کی جگہ (d)غم کا مقام

6۔ حامد کتنے سال کا بچہ ہے؟

(b) دو سال کا (b)چار سال کا (c)چھ سال کا (d)آٹھ سال کا

7۔ حامد کی دادی کا نام کیا ہے؟

(b) امینہ (b)سکینہ (c)جمیلہ (d)نسیمہ

8۔ حامد اور امینہ کے درمیان کون سا رشتہ ہے؟

(b) بیٹا اور ماں (b)نواسہ اور نانی (c)پوتا اور دادی (d)بھائی اور بہن

9۔ حامد نے میلے سے کون سا سامان خریدا تھا؟

(b) گذریا (b)سپاہی (c)بہشتی (d)دست پناہ

10۔ افسانہ ''عید گاہ'' کا مصنف کون ہے؟

(a)پریم چند (b)کرشن چندر (c)راجندر سنگھ بیدی (d)سعادت حسن منٹو

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ افسانہ ''عید گاہ'' کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ افسانہ ''عید گاہ'' کی کہانی کو مختصراً بیان کیجیے۔

3۔ اکائی میں شامل پہلے انتخاب کا خلاصہ لکھیے۔

4۔ حامد کے کردار کی خوبیوں کو بیان کیجیے۔

5۔ افسانہ ''عید گاہ'' کی زبان و بیان پر گفتگو کیجیے۔

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ افسانہ ''عید گاہ'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیجیے۔

2۔ اکائی میں شامل دوسرے انتخاب کو اپنی زبان میں لکھیے۔

3۔ افسانہ ''عید گاہ'' کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	دودھ کی قیمت	پریم چند
2۔	پریم چند (ہندوستانی ادب کے معمار)	پرکاش چند گپت
3۔	پریم چند	ہنس راج رہبرؔ
4۔	پریم چند کے نمائندہ افسانے	قمر رئیس (مرتبہ)
5۔	پریم چند کہانی کا رہنما	جعفر رضا

6.5.1 کے جوابات:

A۔1	C۔2	D۔3	A۔4	C۔5
B۔6	A۔7	C۔8	D۔9	A۔10

اکائی 7: پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات

اکائی کے اجزا

7.0		تمہید
7.1		مقاصد
7.2		پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات
	7.2.1	ناولوں کا تعارف
	7.2.2	نالوں کی موضوعاتی خصوصیات
	7.2.3	ناولوں کی فنی خصوصیات
7.3		اکتسابی نتائج
7.4		کلیدی الفاظ
7.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	7.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	7.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	7.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
7.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

پچھلی دو اکائیوں میں آپ نے پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات اور ان کے ایک مشہور افسانے "عید گاہ" کا خصوصی مطالعہ کیا۔ پریم چند ایک عمدہ افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک بہترین ناول نگار بھی تھے۔ ان کے ناول ہندوستانی سماج کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتے ہیں اور ان میں انسانی جذبات، سماجی نابرابری، دیہی زندگی، طبقاتی کشمکش اور اصلاحی خیالات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ پریم چند اپنے ناولوں کے ذریعے سماج کی برائیوں پر تنقید کرتے ہیں اور بہتر سماج کی تشکیل کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے موضوعات آج بھی انسانی زندگی اور معاشرتی حقیقتوں کے عکاس ہیں۔ موضوعات کے علاوہ ناول کے فن پر بھی پریم چند کی اچھی گرفت تھی۔ ان کی سادہ زبان، حقیقت پسند کردار نگاری، جذبات

نگاری، منظر نگاری اور موزوں تکنیک انہیں ناول نگاری میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ پریم چند کا فن آج بھی قارئین کو متاثر کرتا ہے اورانہیں غور و فکر پر مجبور بھی کرتا ہے۔ اس اکائی میں ہم پریم چند کے چند اہم ناولوں کی انہیں خصوصیات کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- پریم چند ناولوں کا تعارف بیان کر سکیں۔
- پریم چند کے ناولوں کی موضوعاتی خصوصیات پر گفتگو کر سکیں۔
- پریم چند کے ناولوں کی فنی خصوصیات کو سمجھ سکیں۔

7.2 پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات

7.2.1 ناولوں کا تعارف:

اردو اور ہندی کے معروف فکشن نگار منشی پریم چند نے جملہ تیرہ(13) ناول لکھے، جن میں پہلا ناول ''اسرار معابد'' اور آخری ناول ''منگل سوتر'' دونوں ہی نامکمل ہیں۔

1. پریم کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' 1903 فروی سے اکتوبر1905 کے درمیان ہفت روزہ ''آواز خلق''، بنارس میں قسط وار شائع ہوا۔ اس ناول میں مصنف کے طور پر دھنپت رائے عرف نواب رائے لکھا ہوا تھا۔ بعد میں اس ناول کا ترجمہ ہندی میں ''دیوستھان رہسیہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔
2. دوسرا ناول ''ہم خُرما و ہم ثواب'' کے عنوان سے 1907 میں ہندوستان پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوا۔ اس ناول کا ہندی ترجمہ ''پریما'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔
3. ''جلوۂ ایثار'' انڈین پریس، الٰہ آباد سے 1912 میں شائع ہوا۔ اس ناول کا ہندی ترجمہ ''وردان'' کے عنوان سے ''گرنتھ بازار'' سے شائع کیا گیا۔
4. ''بازار حسن'' 1916 میں مکمل ہوا لیکن اردو کے کسی ناشر نے اس کی اشاعت میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ مجبوراً پریم چند نے ہندی میں ''سیوا سدن'' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ 1919 میں شائع ہوا۔ ہندی میں اس ناول کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے 1924 میں اسے اردو میں شائع کیا گیا۔
5. ''گوشۂ عافیت'' 1922 میں مکمل ہوا اور اسے 1928 میں دارالاشاعت، لاہور نے شائع کیا۔ ہندی میں یہ ناول ''پریماشرم'' کے عنوان سے شائع ہوا۔
6. ''چوگان ہستی'' 1924 میں لکھا گیا لیکن اس کی اشاعت 1927 میں عمل میں آئی۔ یہ ناول ہندی میں ''رنگ بھومی'' کے

عنوان سے 1935 میں شائع ہوا۔

7. ناول ''نرملا'' ہندی ماہنامہ چاند میں نومبر 1925 سے لے کر نومبر 1926 تک مسلسل قسط وار شائع ہوا۔ یہ ناول بہت مقبول ہوا۔ اس ناول کو پہلی مرتبہ جنوری 1927 میں چاند پریس نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کے بعد پریم چند نے خود اس کا ترجمہ اردو میں کیا اور گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے 1929 میں شائع کرایا۔

8. پریم چند نے ناول ''پردۂ مجاز'' کو 1926 میں تخلیق کیا اور یہ پہلے ہندی میں ''کایا کلپ'' کے عنوان سے 1926 ہی میں شائع ہوا اس کے بعد لجپت رائے اینڈ سنس، لاہور اردو میں 1934 میں شائع کیا گیا۔

9. پریم چند کا مشہور ناول ''بیوہ'' 1927 اردو میں شائع ہوا۔ اس ناول کا ہندی ترجمہ ''پریگہ'' کے عنوان سے سرسوتی پریس، بنارس سے شائع کیا گیا۔

10. ناول ''غبن'' 1928 میں لکھا گیا اور اسی سال اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ ہندی میں سرسوتی پریس، بنارس نے شائع کیا اور اردو لجپت رائے اینڈ سنس، لاہور نے شائع کیا۔

11. ''میدان عمل'' 1932 میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس ناول کا ہندی ترجمہ ''کرم بھومی'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔

12. ''گئودان'' پریم چند کا آخری ناول ہے جو انہوں نے 1935 میں مکمل کیا لیکن یہ ان کی زندگی میں اردو میں شائع نہ ہو سکا۔ ان کی وفات کے ایک سال بعد 1936 یہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی سے شائع ہوا۔ ہندی میں یہ ناول پریم چند کی زندگی ہی میں سرسوتی پریس، بنارس سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا۔

13. ''منگل سوتر'' ان کا آخری ناول ہے جو مکمل نہ ہو سکا اور پریم چند وفات پا گئے۔

7.2.2 ناولوں کی موضوعاتی خصوصیات:

پریم چند کے ناولوں میں حقیقی زندگی کے مسائل اور عام انسانوں کی جدوجہد کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بناوٹی یا غیر حقیقی دنیا پیش کرنے کے بجائے سچائی کو نمایاں کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں غربت، ذات پات، استحصال، جاگیرداری، برہمن واد، بیواؤں کی حالت، عورتوں کے حقوق، اور دیگر سماجی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی تحریریں معاشرتی اصلاح کا پہلو رکھتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں اخلاقی اور اصلاحی پیغام پایا جاتا ہے۔ وہ ظلم، ناانصافی، اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور عام آدمی کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند کے کئی ناولوں میں آزادی کی تحریک اور قوم پرستی کا عنصر ملتا ہے۔ وہ برطانوی سامراج کے خلاف اور ہندوستانی عوام کی جدوجہد کے حامی تھے۔ انہوں نے ہندوستانی کسانوں اور دیہاتیوں کی غربت، استحصال اور تکالیف کو اپنے ناولوں میں حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں امیر اور غریب، مظلوم اور ظالم، مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان کشمکش دکھائی دیتی ہے، جو اس دور کے

ہندوستانی سماج کی عکاسی کرتی ہے۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں خواتین کی مشکلات،ان کے حقوق اور بیواؤں کی حالت پر خاص توجہ دی ہے۔ان کے ناولوں میں خواتین مضبوط کرداروں کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔

پریم چند وہ اولین ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے عہد کی معاشرت کو اپنے ناولوں میں اس کی پوری جزئیات کے ساتھ پیش کیا۔انھوں نے ادب اور زندگی کے درمیان توازن و تطابق قائم کیا۔پریم چند کے ناولوں میں جو ارتقا موجود ہے وہ اس عہد کے کسی اورناول نگا رکے یہاں نہیں ملتا۔ان کے ابتدائی دور کے ناولوں میں جلوہ ایثار، بیوہ اوربازارحسن منصہ شہود پر آئے ، جن میں حب الوطنی، ہندومعاشرت او راس کے رسم ورواج کو جذباتی شکل میں پیش کیا گیا ہے، پھر رفتہ رفتہ ان کے یہاں جذباتی رنگ مندمل ہوکر نکھری ہوئی عصری آگہی کے رنگ میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ1921ء میں پریم چند کی ناول نگاری نئے عہد میں داخل ہوجاتی ہے۔یہ وہ دور ہے جب انقلاب روس کے اثرات ہندوستان پہنچنا شروع ہوگئے تھے، ترک موالات کی تحریک عروج پر تھی اور پریم چند کے ذہن پر گاندھی کے فلسفے کی یلغار تھی، جس کے زیراثر پریم چند کے موضوعات اور اندازبیان میں خاطرخواہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔چناں چہ انھوں نے ہندوستان کے معاشی اورسیاسی حالات کو ناولوں کا موضوع بنایا۔اس دور کے نمایاں ناولوں میں گوشۂ عافیت،نرملا، چوگان ہستی، پردۂ مجاز، غبن اورمیدان عمل شامل ہیں۔ان نالوں میں اقتصادی مسائل، سماجی حالات، طبقاتی کشمکش، جاگیردارانہ نظام کی پُرتعیش زندگی اور کاشتکاروں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تصویرکشی کی گئی ہے۔

پریم چند کے ناولوں کوموضوعاتی اعتبارسے کو تین حصوں میں تقسیم کیاجاسکتا ہے۔پہلے دور کی تحریروں میں جذباتیت اور رومانیت کا غلبہ ہے۔اس طرز کے اہم ناولوں میں اسرارمعابد،بیوہ، بازارحسن اورجلوہ ایثار شامل ہیں۔دوسرے دورکی تحریروں میں پریم چند کا شعور بالیدہ ہوچکا تھا اس لیے اس دور کے ناولوں میں کسانوں کی مفلسی اورمزدوروں کی بے کسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس دور کے اہم ناولوں میں گوشہ عافیت، نرملا، پردہ مجاز او رچوگان ہستی کو رکھاجاسکتا ہے۔تیسرے دور میں وہ تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں جب پریم چند حقیقت نگاری کے بہت قریب آگئے تھے۔اس تیسرے اور آخری دور کے ناولوں میں میدان عمل اورگئودان ہیں۔

بازار حسن: یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔اس ناول میں پریم چند نے بے جوڑ شادی اور اس کے مضرنتائج کوموضوع بنایا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سمن ایک خوبصورت اور سلیقہ مند لڑکی ہے۔ اس کی شادی ایک عمررسیدہ اورغریب شخص گجادھرسے کردی جاتی ہے جو اس کی عزت نہیں کرتا ہے۔ سمن اپنی خراب معاشی حالات اور شوہر کے ظالمانہ رویے سے پریشان رہتی ہے۔ایک موقع پر اس کا شکی شوہرجب اسے گھر سے نکال دیتا ہے تواسے بھولی بائی طوائف کے کوٹھے پرپناہ ملتی ہے۔ سمن چوں کہ سیدھی سادی ہے اس لیے بھولی بائی کے رکھ رکھاؤ اورچمک دمک سے متاثر ہوجاتی ہے۔اس طرح شوہر کی بے قدری اسے عام لڑکی سے طوائف بنادیتی ہے لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا ہے اورایک سماجی کارکن کی مدد سے وہ اس ماحول سے نکلتی ہے اور ایک باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرتی ہے۔

گوشہ عافیت: اس ناول میں جاگیردارانہ نظام اور کاشتکاروں کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔یہ ناول اس وقت لکھا گیا جب تحریک آزادی زوروں پر تھی اور ہندوستان کے سادہ لوح کاشتکار اپنے حقوق کے لیے آوازبلند کررہے تھے۔گاندھی جی کسانوں کو بڑے زمینداروں اور ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے کئی تحریکوں کا آغاز کرچکے تھے۔ان تحریکوں سے پریم چند نے مثبت اثرات قبول کیے اور طبقاتی کشمکش کے موضوع کے حوالے سے ناول گوشہ عافیت لکھا۔اس ناول میں پہلی بار دہقانی زندگی،اس کی مشکلات اور سماجی ناانصافی کو پیش کیا گیا ہے۔پریم چند کو معلوم تھا کہ ہمارے معاشرہ کے لوگ دو الگ الگ خانوں میں منقسم ہیں: ایک اعلیٰ طبقہ اور ایک ادنیٰ طبقہ۔ان کے مفادات ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔زمیندار جو استحصال کرتا ہے اور کسان جو محنت کرتا ہے، ظلم سہتا ہے اور مشقت کے باوجود بھی کوڑی کوڑی کو ترستا ہے لہٰذا پریم چند کی تمام ہمدردیاں اس نچلے طبقے سے تھیں۔پریم چند جانتے تھے کہ کاشتکاروں کا یہ استحصال اس وقت ختم ہوگا جب ادنیٰ طبقہ اپنے لیے اجتماعی جدوجہد کرے گا۔

نرملا: یہ ایک معاشرتی ناول ہے۔اس میں پریم چند نے معاشرہ میں موجودبعض برائیوں کوموضوع بنایا ہے۔ان میں ایک اہم مسئلہ جہیز کا ہے۔جہیز جیسی لعنت آج بھی نہ صرف سماج میں رائج ہے بلکہ اس کا لین دین معاشرے میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھاجاتا ہے۔جہیز کی وجہ سے کم عمر لڑکیوں کی شادی مجبوراً معمر شخص سے کردی جاتی ہے،جس کے نتیجے میں بے شمار مسائل جنم لیتے ہیں۔بے جوڑ شادی کا اثر کسی ایک فردپرنہیں ہوتا بلکہ اس سے وابستہ تمام رشتوں پر مرتب ہوتا ہے۔'نرملا'میں پریم چند نے فرسودہ رسم ورواج کی شکار عورتوں کے دکھ درد کو موضوع بنایا ہے۔اس ناول کامرکزی کردار نرملا ہے۔اس کی زندگی کا المیہ اس کے والد اودے بھان کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔اودے بھان کی موت کے بعد اس کی ماں کلیانی جہیز کے مطالبے کو پورا کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔اس لیے نرملا کی شادی ایک عمررسیدہ وکیل طوطا رام سے کردی جاتی ہے۔نرملا، طوطارام اور ان کے بچوں پر آنے والی مصیبتوں کااگرجائزہ لیاجائے تواس کابراہ راست تعلق ان دونوں کی بے جوڑ شادی سے جاملتا ہے۔

پردۂ مجاز : اس ناول کا موضوع متوسط طبقہ سے اخذ کیا گیا ہے۔چکردھر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے ، جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد خدمت خلق کرنا چاہتا ہے مگر والدین کے کہنے سے مجبور ہوکر ٹھاکر ہری سیوک سنگھ کی بیٹی منورما کا مدرس مقرر ہوجاتا ہے۔ منورما چکردھر کو پسند کرتی ہے مگرچکردھر کی شادی کسی دوسری لڑکی سے ہوتی ہے۔ منورما اپنی شادی جگدیش پور کے راجہ بشال سنگھ سے کرلیتی ہے تاکہ وہ راجہ بشال سنگھ کی دولت اور اقتدار کے ذریعہ چکردھر کے خدمت خلق کے جذبہ کی تکمیل کرسکے۔بعد میں چکردھر کی بیوی کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ وہ راجہ بشال سنگھ کی گمشدہ بیٹی سکھداہے،اس طرح چکردھر کا لڑکا شنکر دھر ریاست کا وارث بن جاتا ہے۔متوسط طبقہ سے اچانک اعلیٰ طبقہ میں شامل ہوجانادراصل کرداروں کے تضادات کو پیش کرتی ہے۔اچانک دولت کی فراوانی اس کو راس نہیں آتی اور متوسط طبقے سے اعلیٰ طبقے میں شامل ہوکر اپناتوازن کھوبیٹھتی ہے۔اب وہ سہل پرستی اختیار کرلیتی ہے اور قوم کی خدمت کا جذبہ معدوم ہوجاتا

ہے۔چکردھر بھی حکومت اور دولت کے نشے میں قوم کی خدمت کا جذبہ بھول جاتا ہے مگر جلد ہی پریم چند اسے اس کے آدرش کی طرف لے آتے ہیں اور وہ محلوں کی زندگی چھوڑ کر خدمت خلق کرنے لگتا ہے۔

چوگان ہستی: ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ نظام کے ظہور کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔گویا ہندوستان کے لیے یہ ایک بدلتی ہوئی صورت حال تھی۔پریم چند کی نظر نے بدلتے ہوئے معاشرتی نظام کا بغور مشاہدہ کیا اور جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد اور تصادم کو پیش کرنے کی کوشش کی۔اس ناول میں ہر طبقہ کے کردار شامل کرکے ہر طبقے کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔اس ناول کی کہانی ایک نابینا بھکاری کی کہانی ہے وہیں 'پانڈے پور' نامی گاؤں کی بھی کہانی ہے۔نابینا بھکاری کی کہانی کے ساتھ ونے سنگھ اور صوفیہ کی داستان بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے جو قصے میں رنگ آمیزی کا کام کرتی ہے۔نابینا بھکاری کو زمین کا ایک ٹکڑا اپنے اجداد سے ورثے میں ملا ہوا ہے جو ایک چراگاہ کے طورپر کام آتا ہے۔شہر کا ایک عیسائی رئیس جان سیوک، نابینا شخص کی زمین پر سگریٹ کا کارخانہ قائم کرنا چاہتا ہے اور زمین پر قبضہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔نابینا بھکاری اپنی زمین نہیں دینا چاہتا مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجو دناکام ہوجاتا ہے اور جان سیوک زمین پر قابض ہوجاتا ہے۔وہ لوگوں کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ کارخانے میں انھیں مزدوری ملے گی، جب کہ نابینا بھکاری جانتا ہے کہ کارخانہ لوگوں کے لیے تباہی لائے گا۔گویا پریم چند کہناچاہتے ہیں کہ سرمایہ دار طبقے نے اپنی جیبیں بھرنے کے لیے صنعتیں قائم کیں۔انھیں مزدوروں کی ضروریات اور خوشحالی سے کوئی لینادینا نہیں ہے۔

ہم خرما و ہم ثواب: اس ناول کا موضوع بیوہ عورتوں کی دوسری شادی سے متعلق ہے، جسے بالخصوص ہندو مذہب اور بالعموم ہند وستانی مسلمان ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔آج جب کہ اکیسویں صدی میں بھی بعض مسلم خاندانوں میں بیوہ کے نکاح ثانی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور خواتین کی ایک بڑی تعداد جوانی میں بیوہ ہونے کے باوجود نہ خود شادی کرتی ہے اورنہ ہی خاندان اورمعاشرے سے اس کی تحریک وترغیب پاتی ہے۔پریم چند نے بیواؤں کے نکاح ثانی جیسے اہم معاشرتی مسئلے کو جدید تہذیبی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ہم خرما و ہم ثواب میں پیش کیا ہے۔

بیوہ: ناول 'بیوہ' کا موضوع کم وبیش 'ہم خرما و ہم ثواب' جیسا ہے۔یہاں تک کہ اس کے کرداروں کے نام بھی ایک جیسے ہیں۔اس ناول میں پریم چند نے اس وقت کی اصلاحی تحریکوں کو موضوع بنایا ہے۔اس میں ایک طرف تو جدید تعلیم یافتہ کردار ہیں جوہندومذہب میں اصلاح کے خواہاں ہیں۔وہ بیواؤں کی حالت زار پر غو رکرتے ہیں اور ان کے نکاح ثانی پر زور دیتے ہیں۔دوسری طرف بعض کردارایسے بھی ہیں جو سناتن دھرم کے پیروکار ہیں اور قدیم رسم ورواج میں کسی قسم کی تبدیلی کوگوارا نہیں کرتے ہیں۔ناول 'بیوہ' میں پریم چند نے خواتین کے مسائل کے سدباب کے بعض حل بھی پیش کیے ہیں۔ناول کے اختتام کے بعد چند سوالات سامنے آتے ہیں مثلاًبیواؤں کو اپنی گزربسر کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اس کے لیے انھیں اپنی عصمت کا سودا کرلینا چاہیے اور اگر وہ ایسانہیں کرتی ہیں تو سماج ان کی حفاظت کس طرح کرے گا؟ ناول نگار اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگر مظلوم بیواؤں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا توان کے پاس اپنی عزت کی حفاظت

کے لیے خودکشی کے سوا دیگر کوئی راستہ نہیں ہوگا۔اسلام نے اگرچہ اس کاایک حل پیش کیا ہے، جس پر بدقسمتی سے مسلمان عمل پیرانہیں ہیں۔اسلام میں شوہر کی جائداد کے ساتھ ساتھ باپ کی ملکیت میں بھی لڑکی کا حصہ ہے۔اگر یہ دونوں حصے اُسے دے دیے جائیں تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔

جلوۂ ایثار: یہ ناول سوامی وویکانند کی حیات اور شخصیت کی افسانوی شکل ہے۔وویکانند راماکرشنا کے پیروکار تھے۔خود راماکرشنا ایک بنگالی برہمن تھے جو کچھ عرصہ اسلام اور عیسائیت سے متاثر رہے لیکن جلد ہی ہندوازم کی طرف مراجعت کرلی اور خدا فہمی کے لیے عقل کو مسترد کرکے بھگتی یوگا کی تحریک چلائی۔وہ تمام مذاہب کو درست تسلیم کرتے تھے لیکن ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے کو اپنالینا ان کے نزدیک حماقت تھی۔

غبن: غبن کا موضوع ہندوستانی عورت کی زیورات کے تئیں والہانہ محبت ہے۔یہ محبت ہندوستان کی عمومی ثقافت اور اس ثقافت کی رو سے عورت کے محدود ملکیتی استحقاق کے عین مطابق تھی۔جہاں عورت مکمل طور پر مطیع ہو؛ بھائی ، شوہر اور اولاد کے مقابلے میں بھی جس کا استحقاق کمزور ہو وہاں عورت کا زیورات کو اپنا سرمایہ سمجھنا اور نسل درنسل زیورات کی خواہش رکھنے کے بعد اس کا محبت زر میں مبتلا ہوجانا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔زیورات کے تئیں عورت کا اُنس صرف ہندوستان میں ہی نظر نہیں آتا بلکہ دنیا کے تقریباً ہرخطے کی عورتوں میں موجود ہے۔اس ناول میں پریم چند نے بہت سے سماجی مسائل کی نشاندہی کی ہے ،جن میں ایک مسئلہ بیواؤں کا بھی ہے۔ناول کی ضمنی کردار رتن جوانی میں ہی بیوہ ہوجاتی ہے۔ اس کا کردار ایک طرف بیوگی کے المیہ کو سامنے لاتا ہے اوردوسری طرف مشترکہ خاندان میں بیواؤں کا جائداد میں حصہ نہ ہونے پر تنقید کرتا ہے۔اندربھوشن کی وفات کے بعد رتن کو مختلف پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اپنے ہی گھر میں اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی ہیں اور وہ روٹی تک کے لیے دوسروں کی محتاج ہوجاتی ہے۔اس کے شوہر کی وفات کے بعد منی بھوشن تمام جائداد پر قابض ہوجاتا ہے۔ان حالات میں بھی رتن کی خودداری منی بھوشن سے مدد لینا گوارہ نہیں کرتی ہے اوروہ اپنے ہی گھر سے خالی ہاتھ چلی جاتی ہے۔

میدان عمل: یہ ناو ل مکمل طور پر سیاسی جدوجہد کو پیش کرتا ہے۔اس ناول میں برٹش حکمرانوں کے خلاف ہندوستانیوں کی ناراضگی کو موضوع بنایا گیاہے۔پریم چند اس بات کو نمایاں کرتے ہیں کہ اب ہندوستانی عوام بیدار ہوچکی ہے اورانگریزوں سے آزادی چاہتی ہے۔وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کررہی ہے اور کسی بھی قسم کے ظلم وبربریت کوبرداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ناول میں اعلیٰ اورادنیٰ طبقے کے درمیان کشمکش کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں پریم چند کی گاندھی وادیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔اس ناول میں ایک طرف کسانوں کی جدوجہد کو دکھایا گیاہے، تو دوسری طرف مزدوروں کے مسائل کوپیش کیا گیاہے لیکن ہر جگہ عدم تشدد کا اظہا رہوتا نظر آتا ہے۔لیڈرہوں یا عوام سب کے سب گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفے سے متاثر نظرآتے ہیں۔امرکانت گاندھی جی کی سودیشی تحریک کا حمایتی ہے اورچرخہ کاتتا ہے۔

''گئودان'' نہ صرف پریم چند کا بلکہ اردو ادب کا شاہکار ہے۔اس ناول میں انہوں نے آدرش واد کو خیرباد کہہ کر سماجی حقیقت نگاری کی راہ منتخب کی ہے اور اپنی فنی ہنرمندی کا بھی بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔اس ناول میں انھوں نے ایک چالیس سالہ شخص کو ہیرو بنایاہے جو غربت اور بدحالی کی وجہ سے جوانی میں بوڑھا معلوم ہوتا ہے۔ہوری کو انھوں نے ملک کے غریب، مظلوم، تباہ حال اور استحصال زدہ کسانوں کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔بیلاری گاؤں کا کسان ہوری تین بیگھہ زمین کا مالک ہے جس پر کھیتی کرکے وہ اپنااور اپنے اہلِ خانہ کا پیٹ پالتا ہے۔دیگر کسانوں کی طرح وہ بھی کبھی سوکھے اور کبھی سیلاب کی تباہ کاریوں کا شکارہوتا رہتا ہے۔جو فصل پیداہوتی ہے اس میں سے زمیندار، پٹواری، مہاجن اور پروہت کا حصہ دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ اس کے گھر والوں کے گزر اوقات کے لیے کافی نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ انھیں اکثر فاقے کرنے پڑتے ہیں۔ہوری اپنے علاقے کے زمیندار راے صاحب کو اکثر سلام کرنے پہنچتا ہے کہ اس کو لگان وقت پرنہ دینے کی وجہ سے تاوان نہ دینا پڑے۔ہوری کی دلی خواہش ہے کہ اس کے دروازے پر ایک گائے بندھی رہے۔اس سے دروازے کی شوبھا بھی بڑھے گی اور بچوں کو دودھ دہی بھی ملے گا۔اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ بھولا اہیر کو اس کی شادی کرانے کا جھانسہ دیتا ہے لیکن جب اسے بھولا کی پریشانیوں کا علم ہوتا ہے تو گائے لینے سے انکار کردیتا ہے۔ہوری ایک راضی بہ رضا قسم کا انسان ہے۔اس کی سادہ لوحی، شرافت اور ہمدردانہ رویے کے سب قائل ہیں اور اسی لیے بعض افراد اس کا غلط فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ہوری کے برخلاف اس کی بیوی دھنیا اور بیٹا گوبر زمانہ شناس ہیں۔ہوری جسے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل اور قسمت کالکھا سمجھتا ہے ، دھنیا اور گوبر اسے استحصال کے حربے سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ دونوں قدم قدم پر ہوری کو متنبہ کرتے ہیں اور زمیندار، مہاجن اور پروہت کے استحصال کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ہوری اپنی تمام تر محنت اور کوشش کے باوجود غربت اور قرض کی دلدل میں ڈوبتا چلاجاتا ہے۔بڑی بیٹی سونا کی شادی میں زمین گروی رکھتا ہے اورپیسے کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں چھوٹی بیٹی روپا کی شادی ایک ادھیڑ عمر شخص سے کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔وہ لمحہ لمحہ مرتا ہے اور آخر کار اپنے دروازے پر گائے بندھی دیکھنے کی حسرت لیے اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔

''گئودان'' میں پریم چند نے کسانوں کی بدحالی،مزدوروں کی مشکلات اور عورتوں کی زبوں حالی کے ساتھ ساتھ سماج میں ذات پات کی تفریق،اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کی کش مکش اور سماجی و سیاسی نظام میں آنے والی تبدیلیوں سے بھی بہ خوبی واقف کرایا ہے۔اس ناول میں ہوری، گوبر، دھنیا، بھولا وغیرہ کسانوں اور مزدوروں کے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں اور اُگرپال سنگھ(زمیندار)،پنڈت داتا دین (پروہت اور مہاجن) استحصالی قوتوں کے نمائندے ہیں۔یہ ناول جس زمانے میں لکھا گیا اس وقت گاندھی ارون سمجھوتے کے تحت گاندھی جی نے سول نا فرمانی کی تحریک واپس لے لی تھی اور اس کی رُو سے کسانوں کو لگان دینا لازم تھا۔پورے ملک کے کسان اس سے بے حد دکھی تھے اور انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔اس سمجھوتے سے خود پریم چند بھی خوش نہیں تھے اور قومی تحریک سے ان کا موہ بھنگ ہوگیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں وہ کہیں بھی آدرش واد کا سہارا نہیں لیتے اور نہ اس کا انجام بخیر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی تمام تر ہمدردیاں محنت کش طبقے

کے ساتھ ہیں اور اس طبقے کی زندگی کے تمام گوشوں کو انھوں نے پوری جزئیات کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتا محسوس ہوتا ہے۔انھوں نے اعلیٰ طبقے اور سرمایہ داروں کی منافقت اور دوہرے رویے سے بھی نقاب اٹھایا ہے۔''گئودان'' میں ان کی کردار نگاری عروج پر ہے اور سماج کے ہر طبقے کے کرداروں کو انھوں نے حقیقی انداز میں ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس ناول کی کامیابی میں اس کے اسلوب کا بھی اہم کردار ہے جو حقیقت و واقعیت کا تاثر ابھارنے میں حد درجہ معاون ہے۔

7.2.3 ناولوں کی فنی خصوصیات:

پریم چند کے ناول اردو فکشن کی روایت میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ان کے ناولوں میں حقیقت نگاری، سماجی شعور، جاندار کردار نگاری اور سادہ زبان کی دلکشی ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ان کے ناولوں کی سب سے بڑی فنی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کو اس کے اصل روپ میں پیش کرتے ہیں۔دیہات کی غربت، کسانوں کی مجبوری، عورتوں کی مظلومیت، جاگیرداری اور استحصالی قوتوں کی حقیقت ان کے ناولوں میں بڑی سچائی کے ساتھ جھلکتی ہے۔ان کے کردار عام کسان، مزدور، عورتیں، ملازمین اور زمیندار ہیں جو قاری کو اپنے آس پاس کے جیتے جاگتے انسان محسوس ہوتے ہیں۔پریم چند کے ناول حقیقت اور فن کا حسین امتزاج ہیں، جہاں زندگی اپنی پوری سچائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور ادب معاشرتی اصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ بن کر سامنے آتا ہے۔

پلاٹ :

پریم چند کے ناولوں میں پلاٹ ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔پریم چند پلاٹ کو محض کہانی کو آگے بڑھانے کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ اسے زندگی کی ایک مکمل تصویر بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ان کے پلاٹ میں پیچیدگی، غیر ضروری موڑ یا سنسنی خیزی نہیں ہوتی، بلکہ انسانی زندگی کے روزمرہ حالات،ان کے دکھ سکھ، محرومیاں اور سماجی رشتے فطری معلوم ہوتے ہیں۔ وہ واقعات کو بے ربط انداز میں نہیں جوڑتے بلکہ ایک مرکزی خیال یا مرکزی کردار کے گرد سب کو اس طرح پروتے ہیں کہ سارے واقعات ایک لڑی میں بندھی محسوس ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے پلاٹ زیادہ حقیقی اور قاری کے دل سے بہت قریب ہوتے ہیں۔اس خوبی کی بہترین مثال ان کا شاہکار ناول گئودان ہے۔

گئودان کا پلاٹ ایک کسان "ہوری"کی زندگی اور اس کے گرد پھیلے مسائل پر مبنی ہے۔کہانی کے مرکز میں ہوری کی یہ آرزو ہے کہ اپنی زندگی میں ایک گائے حاصل کر لے، کیونکہ گائے کسان کی خوشحالی اور عزت کی علامت ہے۔مگر گائے حاصل کرنے کی یہ خواہش ایک بڑے سماجی المیے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اس پلاٹ میں جاگیرداری، سرمایہ داری، سماجی نابرابری، عورتوں پر مظالم، ذات پات کا فرق، قرض اور بھوک سب کچھ آہستہ آہستہ شامل ہوتے ہیں کہ کسان کی زندگی

محض ذاتی ناکامی نہیں بلکہ پورے سماج کے استحصالی نظام کا نتیجہ ہے۔

گئودان کا پلاٹ اس بات کی عمدہ مثال ہے کہ پریم چند غیر ضروری طوالت یا غیر حقیقی موڑ دینے کے بجائے کہانی کو ایک فطری تسلسل سے آگے بڑھاتے ہیں۔ واقعات میں سچائی ہے، ربط ہے اور ایک تدریجی ارتقا بھی ہے،جو ہوری کی ذاتی زندگی سے پورے ہندوستانی دیہات کی اجتماعی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ پلاٹ کی یہ خوبیاں پریم چند کے دیگر ناولوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

کردار نگاری:

پریم چند کے ناولوں کی سب سے نمایاں فنی خوبی ان کی کردار نگاری ہے۔ وہ کرداروں کو محض کہانی کے جزو کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ انہیں پورے سماجی پس منظر اور انسانی نفسیات کے ساتھ تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے کردار فرضی یا خیالی نہیں بلکہ سماج جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں جو اپنے زمانے کے مختلف طبقوں، حالات اور اخلاقی قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے کردار قاری کے دل و دماغ پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

پریم چند نے کرداروں کی تخلیق میں **زندگی کی سچائی اور فطری پن** کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ وہ کسی کردار کو اچھائی یا برائی کے ایک ہی خانے میں محدود نہیں کرتے بلکہ اس کے اندر کی پیچیدگی، کمزوریاں، جذبات اور مجبوریوں کو بھی ابھارتے ہیں۔ ان کے کردار کبھی غیر حقیقی یا مثالی نہیں لگتے، بلکہ قاری کو اپنے اردگرد کے حقیقی لوگ محسوس ہوتے ہیں۔

پریم چند کے شاہکار ناول گئودان کا مرکزی کردار ہوری ان کے فنِ کردار نگاری کی معراج ہے۔ ہوری محض ایک فرد نہیں، بلکہ پورے ہندوستانی کسان طبقے کا استعارہ ہے۔ اس کی زندگی محنت، قربانی، محرومی اور صبر کا مرقع ہے۔ وہ اپنی گائے حاصل کرنے کی سادہ خواہش میں ساری عمر محنت کرتا ہے، قرض میں ڈوبتا ہے، مگر اس کے باوجود دیانت اور اخلاق سے دستبردار نہیں ہوتا۔ ہوری کے کردار میں پریم چند نے ہندوستانی کسان کی اس ازلی جدوجہد کو پیش کیا ہے،جو استحصالی سماج کے ہاتھوں ہمیشہ کچلا جاتا ہے، لیکن پھر بھی زمین سے اپنا رشتہ نہیں توڑتا۔ ہوری کا کردار قاری کے دل میں ہمدردی، احترام اور دکھ کے احساسات بیدار کرتا ہے۔

اسی ناول کی ایک کردار دھنیا ہوری کی بیوی ہے اور وہ عورت کی صابر، محنتی اور غیر متزلزل قوت کی نمائندہ ہے۔ دھنیا نہ صرف گھر کی ذمہ داریاں نبھاتی ہے بلکہ شوہر کے ساتھ زندگی کی تمام مشکلات میں شریک رہتی ہے۔ اس کے کردار میں عورت کی وہ قوت جھلکتی ہے جو مرد کے مقابلے میں زیادہ پائیدار اور حقیقت پسند ہے۔ دھنیا کا کردار پریم چند کے نسوانی تصور کا مظہر ہے، جہاں عورت محض کمزور مخلوق نہیں بلکہ خاندان کی بنیاد اور استقامت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔

پریم چند کے ناول"بیوہ" کی خاتون کردار" دیوکی " اور "پورنا"ان عورتوں کی نمائندگی کرتی ہیں، جو سماجی رسوم اور روایتوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں۔ پورنا ایک بیوہ عورت ہے جو سماج کے تنگ نظری پر مبنی اصولوں کے خلاف جدوجہد کرتی

ہوئی نظر آتی ہے۔

پورنا کا کردار عورت کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ اس کے شعور اور خودداری کو بھی اجاگر کرتا ہے۔وہ مظلوم ضرور ہے لیکن بے حس نہیں۔ وہ اپنے حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔اس طرح پریم چند نے پورنا کے کردار میں عورت کے اندر کے انسان کو آواز دی ہے۔

اس طرح پریم چند کے کردار صرف کہانی کا حصہ نہیں بلکہ پورے ہندوستانی معاشرے کی زندہ تصویریں ہیں۔ ہوری کی محنت، دھنیا کا صبر اور پورنا کی بے بسی، یہ سبھی کردار انسانیت، سماجی حقیقت اور اخلاقی کشمکش کے مختلف پہلو پیش کرتے ہیں۔ پریم چند نے ان کرداروں کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ ادب زندگی سے جدا کوئی شے نہیں، بلکہ زندگی کی سچائیوں کا ہی آئینہ ہے۔

منظر نگاری:

پریم چند کے ناولوں میں منظر نگاری محض پس منظر یا سجاوٹ نہیں بلکہ معنوی اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ان کے مناظر میں صرف فضا یا مقام کی جھلک نہیں بلکہ پورے سماجی اور تاریخی عہد کا عکس جھلکتا ہے۔ ان کی منظر نگاری حقیقت اور جذبے کا ایسا امتزاج پیش کرتی ہے جس سے قاری صرف دیکھتا نہیں بلکہ محسوس بھی کرتا ہے۔

مثال کے طور پر "گئودان" میں کھیتوں کی اجڑی ہوئی حالت، ہل جوتتے کسانوں کی پسینے میں بھیگے جسم، دھوپ کی تپش اور زمین کی باسی خوشبو صرف مناظر نہیں، بلکہ ہندوستانی کسان کی زندگی کا دردناک مرقع ہیں۔ پریم چند جب گاؤں کے مناظر بیان کرتے ہیں تو ان کے لفظوں سے دھرتی کی سانسیں سنائی دیتی ہیں۔ کھیتوں کی ویرانی صرف زمین کی زرخیزی کی کمی نہیں بلکہ کسان کی محرومی اور سماجی ناانصافی کی علامت بن جاتی ہے۔ ہر منظر سماج کے ایک پہلو کو بے نقاب کرتا ہے۔

اسی طرح "بازارِ حسن" میں شہر کی گلیاں، روشن محفلیں، بوسیدہ مکان اور طوائفوں کے کوچے محض مکانی تفصیلات نہیں بلکہ تہذیبی زوال اور اخلاقی تضاد کے استعارے ہیں۔ پریم چند نے ایک طرف چمکتے بازاروں اور اونچی عمارتوں کی چمک دکھائی، تو دوسری طرف ان کے نیچے دبی عورتوں کی بے بسی اور اذیت کو منظر کے ساتھ جوڑ کر دکھایا۔ ان کے مناظر صرف بصری نہیں بلکہ جذباتی اور فکری بھی ہیں، ہر منظر کے پیچھے ایک معنی اور ایک احساس پوشیدہ ہوتا ہے۔ پریم چند کی یہ فنی خوبی ہے کہ وہ منظر کو کردار اور مرکزی خیال سے جدا نہیں کرتے۔ ان کی منظر نگاری محض دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ سمجھنے کے لیے ہے۔ گاؤں کے دھوئیں سے اٹے آسمان، کچی مٹی کی جھونپڑیاں، یا شہر کے شور سے بھرے راستے ،سب ان کے عہد کی سماجی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

جزئیات نگاری:

جزئیات نگاری ناول کا ایک اہم جزو ہوتی ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں جزئیات نگاری ان کے فن کا ایک نمایاں اور جاندار پہلو ہے۔ وہ نہ صرف بڑے واقعات یا جذبات پر توجہ دیتے ہیں بلکہ زندگی کی معمولی، عام، اور بظاہر غیر اہم تفصیلات کو بھی فنی اہمیت دیتے ہیں۔

یہی جزئیات نگاری ان کے ناولوں کو حقیقت کے قریب لے آتی ہیں۔

پریم چند کا مشاہدہ بہت گہرا اور باریک ہے۔ وہ کرداروں کی چال ڈھال، لب ولہجہ، کپڑوں کی حالت، مکان کی بناوٹ اور روزمرہ کے معمولات کو اتنی دقت سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے پورا منظر جیتا جاگتا اُبھر آتا ہے۔ مثال کے طور پر "گئودان" میں ہوری کا پسینے سے شرابور بدن، پھٹے کپڑوں کی جھلک، مٹی سے اٹے پیڑ اور اس کے جھونپڑے کا بوسیدہ دروازہ، سب کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری گویا اس کے گاؤں کی گلیوں میں چلنے لگتا ہے۔ اسی طرح "بازارِ حسن" میں پریم چند عورتوں کے لباس، ان کے کمرے کی آرائش، خوشبوؤں اور سازوں کی آوازوں تک کو بڑی نفاست سے بیان کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح سمنی کا کمرہ ایک طرف زینت اور رنگینی سے بھرا ہے، مگر دوسری طرف اس کے اندر اداسی اور قید کا احساس رچ بس گیا ہے۔ یہ تفصیلات کردار کے داخلی دکھ کو ظاہر کرتی ہیں، یعنی جزئیات نگاری صرف ظاہری نہیں بلکہ معنوی بھی ہیں۔

تکنیک:

پریم چند کے ناولوں کی تکنیک ان کی فنی مہارت اور حقیقت نگاری کی بنیاد ہے۔ وہ کسی ایک مخصوص طرزِ تحریر کے پابند نہیں بلکہ زندگی کی نوعیت اور موضوع کے مطابق فنی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تکنیک سادگی کے باوجود معنوی گہرائی رکھتی ہے، جس سے ان کی کہانیاں دل میں اتر جاتی ہیں۔ سب سے پہلے ان کے ناولوں میں بیان کا حقیقت پسندانہ انداز نمایاں ہے۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ کسی بنائے ہوئے فسانے کے بجائے زندگی کے مشاہدے معلوم ہوتے ہیں۔ گئودان، بازارِ حسن اور نرملا میں واقعات کا بہاؤ بالکل قدرتی ہے، کہیں بھی غیر فطری موڑ یا مصنف کی مداخلت محسوس نہیں ہوتی۔

دوسری اہم تکنیک کردار کے ذریعے واقعات کی پیش رفت ہے۔ پریم چند کہانی کو کرداروں کے عمل اور فیصلوں کے ذریعے آگے بڑھاتے ہیں، نہ کہ کسی خارجی واقعے کے زور پر۔ اس لیے ان کے ناولوں میں کردار ہی کہانی کا مرکز بن جاتے ہیں، جیسے ہوری، دھنیا، نرملا یا سمنی۔ تیسری خصوصیت ان کی واقعاتی وحدت اور توازن ہے۔ وہ ضمنی واقعات کو بھی مرکزی کہانی سے جوڑ دیتے ہیں تاکہ پورا ناول ایک مربوط اکائی بن جائے۔ ان کے یہاں قصہ گوئی کے بجائے ایک منظم اور مسلسل بیانیہ ملتا ہے۔ چوتھی تکنیک مکالمہ نگاری ہے، جو فطری، طبقاتی اور کردار کے مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ ان کے مکالموں میں تصنع نہیں بلکہ دیہات کی سادگی اور شہری زندگی کا لہجہ حقیقی طور پر جھلکتا ہے۔ پانچویں فنی خوبی ان کی علامتی اور جزئیاتی تکنیک* ہے۔ وہ کسی منظر یا شے کو علامت بنا کر پورے عہد کی حقیقت پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ہوری کا بیل خریدنے کا خواب صرف ایک کسان کی خواہش نہیں بلکہ دیہی ہندوستان کے معاشی استحصال کی علامت بن جاتا ہے۔ آخر میں ان کے ناولوں کی بیانی تکنیک میں توازن پایا جاتا ہے۔

زمان و مکان:

پریم چند کے ناولوں میں زمان و مکان کا عنصر نہایت گہرائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کسی کہانی کو محض ایک خیالی پس منظر میں نہیں رکھتے بلکہ اسے اپنے عہد، سماج اور طبقاتی حالات کے اندر بُن دیتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں زمان و مکان صرف منظر کی تعیین نہیں کرتے بلکہ کرداروں کے شعور، واقعات کے بہاؤ اور معاشرتی تضادات کی وضاحت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

پریم چند کے یہاں "زمانہ" محض وقت کی حد بندی نہیں بلکہ ایک پورے تاریخی اور سماجی پس منظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "گئودان" میں بیسویں صدی کے اوائل کا ہندوستانی دیہات پیش کیا گیا ہے، جہاں کسان طبقہ جاگیرداری، سود خوری اور طبقاتی استحصال کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ زمانہ برطانوی سامراج کے تسلط، معاشی بدحالی اور دیہی زندگی کے زوال کا دور ہے۔ پریم چند اس پورے عہد کی دھڑکن کو محسوس کر کے اپنی کہانی میں شامل کرتے ہیں، جس سے ناول محض ایک فرد یا خاندان کی داستان نہیں بلکہ پورے سماج کی تاریخ بن جاتا ہے۔ جہاں تک مکان کا تعلق ہے، پریم چند گاؤں اور شہر دونوں فضاؤں کے ماہر مصور ہیں۔ گاؤں میں مٹی کے گھر، کچی گلیاں، بیلوں کے ہل، کسانوں کے پسینے اور بھوک کی تصویریں ایسی صداقت سے ابھرتی ہیں کہ قاری کو اپنے آس پاس کے دیہات یاد آنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے شہری مناظر جیسے بازارِ حسن کے کوچے، روشنیوں سے جگمگاتی محفلیں اور بوسیدہ کمروں کی خاموشی، معاشرتی تضاد اور طبقاتی خلیج کو ظاہر کرتے ہیں۔ پریم چند کے یہاں زمان و مکان ہمیشہ کرداروں کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے کردار اپنے عہد کی پیداوار ہیں اور اپنے ماحول کے قیدی بھی۔ گئودان کا ہوری اگر کسی اور زمانے یا فضا میں ہوتا تو وہ وہی ہوری نہ رہتا۔ اس کی محنت، غربت، ایمان داری اور استحصال سب اسی وقت اور مقام کے ساتھ معنویت رکھتے ہیں۔

اسلوب اور زبان و بیان:

پریم چند کے ناولوں میں اسلوب اور زبان و بیان ان کے فن کی روح اور ان کی مقبولیت کا بنیادی سبب ہے۔ ان کا اسلوب نہ صرف فصاحت و بلاغت کا حامل ہے بلکہ سادگی، روانی، تاثیر اور حقیقت نگاری سے بھی معمور ہے۔ وہ نہ خطیبانہ زبان استعمال کرتے ہیں، نہ ہی شاعرانہ مبالغہ آرائی، بلکہ ایک خالص، سادہ اور عوامی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

پریم چند کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے۔ ان کی زبان عام بول چال سے قریب ہے، مگر اس میں ادبی وقار بھی برقرار رہتا ہے۔ وہ مشکل الفاظ، فارسی تراکیب یا غیر ضروری لفاظی سے گریز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول گاؤں کے کسان سے لے کر شہر کے تعلیم یافتہ قاری تک سب کے لیے یکساں پرکشش ہیں۔ ان کا بیان سادہ ضرور ہے مگر جذباتی، فکری اور معنوی لحاظ سے انتہائی بلیغ اور موثر ہے۔

پریم چند کی زبان میں اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ ان کے جملے قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں۔ وہ وعظ نہیں کرتے بلکہ زندگی کی سچائیوں کو کہانی کے اندر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پیغام خود بخود قاری کے ذہن میں اُبھر آتا ہے۔ مثال کے طور پر "گئودان" میں وہ کسان کی محنت، استحصال اور قربانی کو اس قدر فطری انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری خود سماجی ناانصافی کے خلاف سوچنے لگتا ہے، بغیر اس

کے کہ مصنف نے کوئی صریح نصیحت کی ہو۔ پریم چند کے جملے عام طور پر مختصر اور سادہ ہوتے ہیں، مگر ان میں جذباتی شدت اور فکری گہرائی پائی جاتی ہے، جس سے کرداروں کی بول چال حقیقی محسوس ہوتی ہے۔ وہ طبقاتی فرق کے لحاظ سے زبان میں بھی باریک تبدیلیاں کرتے ہیں۔ کسانوں کے مکالمے دیہاتی سادگی لیے ہوتے ہیں، جب کہ شہری کرداروں کی گفتگو میں مہذب شائستگی جھلکتی ہے۔

پریم چند کے بیان میں طنز، ہمدردی اور حقیقت پسندیکا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ دکھ دکھا کر قاری کو رُلاتے ہیں، مگر ساتھ ہی امید اور انسان دوستی کی جھلک بھی دیتے ہیں۔ ان کے جملے براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں کیونکہ وہ تصنع سے پاک، اخلاقی شعور سے روشن اور انسانی تجربے سے بھرپور ہیں۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند کے ناولوں میں فنی خوبیوں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے پلاٹ سادہ مگر مربوط اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ کردار جیتے جاگتے انسانوں کی طرح قاری کے دل میں جگہ بناتے ہیں۔ منظر نگاری کے ذریعے وہ پورے عہد اور سماج کی تصویر کھینچ دیتے ہیں، جب کہ جزئیات نگاری ان کے فن میں گہرائی اور زندگی پیدا کرتی ہے۔ ان کے ناولوں کے اسلوب اور زمان و مکان حقیقت سے جڑے ہوئے ہیں، جو کرداروں اور ان کے حالات کو فطری طور پر سامنے لاتے ہیں۔ پریم چند کا اسلوب و بیان سادہ، مؤثر اور انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ مجموعی طور پر ان کے ناول فن اور حقیقت کا ایسا امتزاج پیش کرتے ہیں جو اردو فکشن کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

7.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- پریم چند ایک عمدہ افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک بہترین ناول نگار بھی تھے۔
- اردو اور ہندی کے معروف فکشن نگار منشی پریم چند نے جملہ تیرہ(13) ناول لکھے، جن میں پہلا ناول "اسرار معابد" اور آخری ناول "منگل سوتر" دونوں ہی نامکمل ہیں۔
- پریم چند کے ناول ہندوستانی سماج کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتے ہیں اور ان میں انسانی جذبات، سماجی نابرابری، دیہی زندگی، طبقاتی کشمکش اور اصلاحی خیالات کو نمایاں کیا گیا ہے۔
- پریم چند کے ناولوں میں حقیقی زندگی کے مسائل اور عام انسانوں کی جدوجہد کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بناوٹی یا غیر حقیقی دنیا پیش کرنے کے بجائے سچائی کو نمایاں کرتے ہیں۔
- پریم چند اپنے ناولوں کے ذریعے سماج کی برائیوں پر تنقید کرتے ہیں اور بہتر سماج کی تشکیل کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے موضوعات آج بھی انسانی زندگی اور معاشرتی حقیقتوں کے عکاس ہیں۔
- پریم چند کے ناول سادہ زبان، حقیقت پسند کردار نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور موزوں تکنیک کی بنا پر ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔
- پریم چند کے ناولوں کی تکنیک ان کی فنی مہارت اور حقیقت نگاری کی بنیاد ہے۔ وہ کسی ایک مخصوص طرزِ تحریر کے

پابند نہیں بلکہ زندگی کی نوعیت اور موضوع کے مطابق فنی طریقے اختیار کرتے ہیں۔

- پریم چند کے ناولوں کو موضوعاتی اعتبار سے کو تین حصوں میں تقسیم کیاجاسکتا ہے۔پہلے دور کی تحریروں میں جذباتیت اور رومانیت کا غلبہ ہے۔
- دوسرے دورکی تحریروں میں پریم چند کا شعور بالیدہ ہوچکا تھا اس لیے اس دور کے ناولوں میں کسانوں کی مفلسی اورمزدوروں کی بے کسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔
- تیسرے دورمیں وہ تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں جب پریم چند حقیقت نگاری کے بہت قریب آگئے تھے۔اس تیسرے اور آخری دور کے ناولوں میں میدان عمل اور گئودان خاص اہمیت کے حامل ہیں۔
- پریم چند کا اسلوب وبیان سادہ،مؤثراور انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ مجموعی طور پر پریم چند کے ناول فن اور حقیقت کا ایسا امتزاج پیش کرتے ہیں جو اردو فکشن کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

7.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
عکاسی	:	تصویر کشی، کسی چیز یا حقیقت کو ظاہر کرنا، عکس بنانا
کشمکش	:	جدوجہد، ذہنی یا عملی کھینچا تانی
موزوں	:	مناسب، لائق، متناسب، درست
بیوہ	:	وہ عورت جس کا شوہر وفات پا چکا ہو
میدان عمل	:	کام کرنے کی جگہ، سرگرمی یا جدوجہد کا میدان
جدوجہد	:	محنت، کوشش، سعی و عمل
استحصال	:	ظلم کرنا،کسی کمزور کا ناجائز فائدہ اٹھانا
برطانوی سامراج	:	انگریزوں کی حکمرانی یا اقتداری نظام
جزئیات	:	باریکیاں، چھوٹی چھوٹی تفصیلات
توازن	:	برابری، اعتدال، ہم آہنگی
تطابق	:	مطابقت، میل کھانا، ایک دوسرے سے مشابہ ہونا
اقتصادی مسائل	:	دولت یا روزگار سے متعلق مسائل
حب الوطن	:	وطن سے محبت، وطن پرستی
کاشتکار	:	زمین کاشت کرنے والا، کسان

سادہ لوح	:	بھولا بھالا، نیک دل مگر کم فہم
سناتن دھرم	:	قدیم ہندو مذہب، ہندو دھرم کا اصل نام
استحقاق	:	حق دار ہونا، کسی چیز کے قابل یا لائق ہونا
مطیع	:	فرمانبردار، حکم ماننے والا
متزلزل	:	غیر مستحکم، ڈگمگاتا ہوا، کمزور
بوسیدہ	:	: پرانا، خستہ حال، گھسا پٹا
وحدت	:	یگانگت، اتحاد
صریح نصیحت	:	کھلی اور واضح نصیحت، صاف طور پر کی گئی تلقین
امتزاج	:	ملاپ، آمیزش، دو یا زیادہ چیزوں کا مل جانا

7.5 نمونۂ امتحانی سوالات

7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کی ناول نگاری کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟

(a) تین (b)پانچ (c)دو (d)چار

2۔ پریم چند نے کتنے ناول لکھے؟

10(a) 15(b) 13 (c) 16(d)

3۔ پریم چند کا پہلا ناول کون سا ہے؟

(a) نرملا (b)گئودان (c)منگل سوتر (d)اسرار معابد

4۔ پریم کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد''کس رسالے میں شائع ہوتا تھا؟

(a)آواز خلق (b)زمانہ (c)ہنس (d)نیادور

5۔ ناول''جلوۂ ایثار''کا ہندی ترجمہ کس عنوان سے ہوا؟

(a) سیوا سدن (b) پریما (c)وردان (d)جنم بھومی

6۔ ناول"بارا حسن"کس سنہ میں شائع ہوا؟

1914(a) 1916(b) 1918(c) 1920(d)

7۔ پریم چند کا آخری مکمل ناول کون سا ہے؟

(a)گئودان (b) گوشۂ عافیت (c)نرملا (d)غبن

8۔ پریم چند کے کون کون سے ناول ادھورے ہیں؟

(a)اسرار معابد۔میدان عمل (b)گئودان۔منگل سوتر (c)اسرار معابد۔منگل سوتر (d)غبن۔نرملا

9۔ "ہوری" کس ناول کا کردار ہے؟

(a)چوگان ہستی (b)بیوہ (c)بازار حسن (d)گئودان

10۔ "کرم بھومی" کس ناول کا ہندی ترجمہ ہے؟

(a)میدان عمل (b)نرملا (c)منگل سوتر (d)بازار حسن

7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کے ناولوں میں پلاٹ کی اہمیت کو اجاگر کیجیے۔

2۔ پریم چند کے ناولوں کے کرداروں کے بارے میں لکھیے۔

3۔ پریم چند کے ناولوں میں زماں و مکاں کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

4۔ پریم چند کے ناولوں کی تکنیک پر سیر حاصل گفتگو کیجیے۔

5۔ پریم چند کے ناولوں کی زبان و بیان پر نوٹ لکھیے۔

7.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کے ناولوں کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ پریم چند کے ناولوں کی موضوعاتی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ پریم چند کے ناولوں کی فنی موضوعاتی خصوصیات پر روشنی ڈالیے کیجیے۔

7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔ پریم چند کی ناول نگاری — یوسف سرمست

2۔ پریم چند فن اور تعمیر فن — جعفر رضا

3۔ پریم چند کچھ نئے مباحث — مانک ٹالا

4۔ پریم چند اور تصانیف پریم چند — مانک ٹالا

5۔ پریم چند شناسی — آفاق احمد

7.5.1 کے جوابات: A-1 C-2 D-3 A-4 C-5

B-6 A-7 C-8 D-9 A-10

اکائی 8: ناول "نرملا" کا تجزیاتی مطالعہ

اکائی کے اجزا

8.0		تمہید
8.1		مقاصد
8.2		ناول "نرملا" کا تجزیاتی مطالعہ
	8.2.1	ناول کا تعارف
	8.2.2	ناول کا منتخب متن
	8.2.3	ناول کا تجزیاتی مطالعہ
8.3		اکتسابی نتائج
8.4		کلیدی الفاظ
8.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	8.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	8.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	8.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
8.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات کا مطالعہ کیا۔ یوں تو پریم چند نے درجنوں ناول لکھے ہیں، لیکن ان کے چند ناول ایسے ہیں جن میں بطور خاص خواتین کے بنیادی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان ناولوں میں "بیوہ"، "بازارِ حسن" اور "نرملا" اہم ہیں۔ ان تینوں ناولوں میں "نرملا" اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایک عام گھریلو عورت کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے، جو حقیقتاً ہمیں ہندوستانی معاشرے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ناول پریم چند کی عام شناخت کے برعکس شہری پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس اکائی میں ہم ناول "نرملا" کے منتخب متن کی قرأت کریں گے نیز ناول کا تجزیاتی مطالعہ بھی کریں گے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ناول "نرملا" سے واقف ہو سکیں۔
- ناول "نرملا" کے منتخب متن کی قرأت کر سکیں۔
- ناول "نرملا" کا تجزیاتی مطالعہ کر سکیں۔
- ناول "نرملا" کے بنیادی مقصد سے روشناس ہو سکیں۔

8.2 ناول ''نرملا'' کا تجزیاتی مطالعہ

8.2.1 ناول کا تعارف:

ناول ''نرملا'' ہندی ماہنامہ چاند میں نومبر 1925 سے لے کر نومبر 1926 تک مسلسل قسط وار شائع ہوا۔ یہ ناول بہت مقبول ہوا۔ اس ناول کو پہلی مرتبہ جنوری 1927 میں چاند پریس نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کے بعد پریم چند نے خود اس کا ترجمہ اردو میں کیا اور گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے 1929 میں شائع کرایا۔ پریم چند کا یہ تیسرا ایسا ناول ہے جو ایک عورت پر مرکوز ہے۔ اس سے قبل پریم چند کے دو ناول ''بیوہ'' اور ''بازار حسن'' خواتین پر مرکوز شائع ہو چکے تھے۔ نرملا ایک عام عورت ہے جو زندگی سے بھر پور ہے، جس میں انسانی خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہیں، وہ نہ کوئی مثالی کردار ہے اور نہ بگڑی ہوئی عورت ہے۔ اس ناول میں عام گھریلو زندگی کے بہانے انسانی زندگی اور سماج کی کئی برائیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور سب کچھ ناول کے فنی دائرہ کار میں رہ کر کیا گیا ہے۔ محض عورتوں کے مسائل کو پیش کرنے کے لیے ناول کا سہارا نہیں لیا گیا ہے، اس میں زندگی کو فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول موضوعاتی اور فنی اعتبار سے عورتوں پر مرکوز پریم چند کے دیگر ناولوں سے بہتر ہے۔

8.2.2 ناول کا منتخب متن:

(i)

یوں تو بابو اُودے بھان لال کے گھر میں بیسوں آدمی تھے۔ کوئی ماموں زاد بھائی تھا کوئی پھوپی زاد۔ کوئی بھانجا تھا کوئی بھتیجا۔ لیکن یہاں ہم کو ان سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ اچھے وکیل تھے ان پر لکشمی مہربان تھی۔ پس غریب کنبہ والوں کی مدد کرنا ان کا فرض تھا۔ ہمارا مطلب تو صرف ان کی دونوں لڑکیوں سے ہے جن میں بڑی کا نام نرملا اور چھوٹی کا نام کرشنا تھا۔ ابھی کل تک دونوں ساتھ ساتھ گڑیاں کھیلتی تھیں۔ نرملا کا پندرہواں سال تھا اور کرشنا کا دسواں۔ پھر بھی ان کے مزاج میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ دونوں شوخ لہو ولعب کی دلدادہ اور سیر و تماشا کی شیدائی تھیں۔ دونوں گڑیوں کا دھوم دھام سے بیاہ رچاتی تھیں اور کام سے ہمیشہ جی چرایا کرتی تھیں۔ ماں پکارا کرتی مگر دونوں

کوٹھے پر چھپی بیٹھی رہتیں کہ نہ جانے کس کام کے لیے بلاتی ہو۔ دونوں اپنے بھائیوں سے لڑتیں، نوکروں کو ڈانٹ بتاتیں اور باجہ کی آواز سنتے ہی دروازہ پر جا کر کھڑی ہو جایا کرتیں۔ مگر آج دفعتاً ایک ایسی بات ہو گئی ہے، جس نے بڑی کو بڑی اور چھوٹی کو چھوٹی بنا دیا ہے۔ کرشنا وہی ہے مگر نرملا، تنہائی پسند اور حیادار ہو گئی ہے۔ اِدھر مہینوں سے بابو اُودے بھان لال نرملا کے بیاہ کی بات چیت کر رہے تھے۔ آج ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ بابو بھال چند سنہا کے بڑے صاحب زادے بھون موہن سنہا سے نسبت پختہ ہو گئی۔ لڑکے کے والد نے کہہ دیا ہے کہ آپ کے مزاج میں آئے جہیز دیں یا نہ دیں مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ البتہ بارات میں جو لوگ جائیں ان کی خاطر تواضع بخوبی ہونی چاہیے کہ میری اور آپ کی بدنامی نہ ہو۔ بابو اُودے بھان لال تھے تو وکیل مگر دولت جمع کرنا نہ جانتے تھے۔ جہیز دینا ان کے لیے ایک مشکل مسئلہ تھا۔ اس لیے جب لڑکے کے والد نے کہہ دیا کہ مجھے جہیز کی پرواہ نہیں تو گویا انہیں آنکھیں مل گئیں خوف تھا کہ نہ جانے کس کس کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑے۔ دو تین مہاجنوں سے معاملہ ٹھیک کر رکھا تھا۔ ان کا قیاس تھا کہ نہایت کفایت کرنے پر بھی بیس ہزار سے کم خرچ نہ ہوں گے۔ یہ تشفی پا کر وہ خوشی سے جامہ میں پھولے نہ سمائے۔

اسی خبر نے معصوم لڑکی کو منہ ڈھانک کر ایک گوشہ میں بٹھا رکھا ہے۔ اس کے دل میں ایک عجیب خوف جاگزیں ہو گیا ہے۔ اس کے روئیں روئیں میں اس نامعلوم خوف کا اثر ہے نہ جانے کیا ہو گا؟ اس کے دل میں وہ امنگیں نہیں ہیں، جو بتانِ نوخیر کی آنکھوں میں ترچھی چتون بن کر، ان کے ہونٹوں پر شیریں تبسم ہو کر اور ان کے سارے عضا میں خود رفتگی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ نہیں، وہاں تمنّائیں نہیں، بلکہ خوف، تفکر اور بزدلانہ توہم سے شباب ابھی کھلا نہیں ہے۔

کرشنا کچھ کچھ جانتی ہے اور کچھ کچھ نہیں جانتی۔ وہ جانتی ہے کہ بہن کو اچھے اچھے گہنے ملیں گے۔ دروازے پر باجے بجیں گے۔ مہمان آئیں گے۔ ناچ ہو گا۔ یہ جان کر وہ خوش ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ بہن سب کے گلے مل کر روئے گی۔ یہاں سے رو دھو کر چلی جائے گی اور میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ یہ جان کر وہ مغموم ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ یہ سب کس لیے ہو رہا ہے۔ ماں اور باپ کیوں بہن کو گھر سے نکالنے پر اس قدر تُلے ہوئے ہیں۔ بہن نے تو کسی کو کچھ نہیں کہا۔ کسی سے لڑائی نہیں کی۔ کیا اسی طرح ایک دن مجھے بھی یہ لوگ نکال دیں گے؟ میں بھی اسی طرح کونے میں بیٹھ کر روؤں گی اور کسی کو مجھ پر رحم نہ آئے گا؟ اس خیال سے وہ خائف بھی ہو رہی ہے۔

شام کا وقت تھا۔ نرملا چھت پر جا کر تنہا بیٹھی ہوئی آسمان کی طرف اشتیاق آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جی میں آیا تھا کہ اگر پَر ہوتے تو اُڑ جاتی اور ان تمام جھنجھٹوں سے چھٹکارا پا جاتی۔ اس وقت اکثر دونوں بہنیں کہیں سیر کے لیے جایا کتی تھیں۔ بگھی خالی نہ ہوتی تو باغیچہ میں ٹہلا کرتیں۔ اس لیے کرشنا اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ کہیں نہ پا کر وہ چھت پر گئی اور اسے دیکھتے ہی ہنس کر بولی:

''تم یہاں آ کر بیٹھی ہو اور میں تمہیں ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ چلو بگھی تیار کر آئی ہوں۔''

نرملا نے بے پروائی سے کہا: ''تو جا۔ میں نہ جاؤں گی۔''

کرشنا: نہیں میری اچھی دیدی۔ آج ضرور چلو۔ دیکھو کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔

نرملا: میرا جی نہیں چاہتا۔ تو چلی جا۔

کرشنا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کانپتے ہوئے لہجہ میں بولی: ''آج تم کیوں نہیں چلتیں؟ مجھ سے کیوں نہیں بولتیں؟ کیوں اِدھر اُدھر چھپتی پھرتی ہو؟ میرا جی اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبراتا ہے۔ تم نہ چلو گی تو میں بھی نہ جاؤں گی۔ یہیں تمہارے پاس بیٹھی رہوں گی۔

نرملا: اور جب میں چلی جاؤں کی تک کیا کرے گی؟ تب کس کے ساتھ کھیلے گی، کس کے ساتھ گھومنے جائے گی؟ بتا!

کرشنا: میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھ سے اکیلے یہاں نہ رہا جائے گا۔

نرملا مسکرا کر بولی۔ ''تجھے اماں نہ جانے دیں گی۔''

(ii)

نرملا کا بیاہ ہو گیا، سسرال آ گئی۔ وکیل صاحب کا نام تھا منشی طوطارام، سانولے رنگ کے موٹے آدمی تھے۔ عمر تو ابھی چالیس سے زیادہ نہ تھی مگر وکالت کی سخت محنت نے سر کے بال سفید کر دیے تھے۔ ورزش کرنے کی انہیں فرصت نہ تھی۔ یہاں تک کہ کبھی کہیں گھومنے بھی نہ جاتے تھے۔ اس لیے پیٹ بڑھ گیا تھا۔ بدن کے فربہ ہونے پر بھی آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت بنی رہتی۔ بد ہضمی اور بواسیر سے تو ان کی مستقل رفاقت تھی۔ پس بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ان کے تین لڑکے تھے۔ بڑا منسارام سولہ سال کا تھا۔ منجھلا جیارام بارہ سال اور چھوٹا سیارام سات سال کا۔ تینوں انگریزی پڑھتے تھے۔ گھر میں وکیل صاحب کی بیوہ بہن کے سوا کوئی عورت نہ تھی۔ وہی گھر کی مالکہ تھی۔ اس کا نام رکمنی اور اس کی عمر پچاس سال سے زائد تھی۔ سسرال میں کوئی نہ تھا۔ مستقل طور پر یہیں رہتی تھی۔

طوطارام ازدواج سے خوب واقف تھے۔ نرملا کو خوش کرنے کے لیے ان میں جو قدرتی کمی تھی، اسے وہ تحفہ جات سے پوری کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ نہایت کفایت شعار آدمی تھے مگر نرملا کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ روز لایا کرتے۔ موقع پر روپیہ کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ خود کبھی ناشتہ نہ کرتے تھے، لڑکوں کے لیے تھوڑا تھوڑا دودھ آتا تھا مگر نرملا کے لیے میوے، مربّے، مٹھائیاں، کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی سیر تماشہ کے لیے نہ گئے تھے۔ مگر تعطیل میں نرملا کو سنیما، سرکس، تھیٹر دکھلانے لے جاتے۔ اپنے بیش قیمت وقت کا تھوڑا حصہ اس کے ساتھ بیٹھ کر گراموں فون بجانے میں گزارتے۔

لیکن نرملا کو نہ جانے کیوں طوطارام کے پاس بیٹھنے اور ان سے ہنستے بولنے میں تامّل ہوتا تھا۔ اس کا شاید یہ سبب تھا کہ اب تک اسی قسم کا ایک شخص اس کا باپ تھا جس کے سامنے وہ سر جھکا کر اور بدن چھپا کر نکلتی تھی۔ اب اسی عمر کا ایک اس کا شوہر تھا۔ وہ اسے محبت کی چیز نہیں عزت کی چیز سمجھتی تھی۔ ان سے بھاگتی پھرتی۔ ان کو دیکھتے ہی اس کی خوشی کافور ہو جاتی تھی۔

وکیل صاحب کو ان کے علم ازدواج نے سکھلایا تھا کہ نوجوان عورت سے خوب محبت بھری باتیں کرنی چاہییں۔ اس کے سامنے دل نکال کر رکھ دینا چاہیے۔ اس کا تسخیر کا خاص منتر ہے۔ پس وکیل صاحب اپنے اظہار محبت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ مگر نرملا کو ان باتوں سے نفرت ہوئی تھی۔ وہی باتیں جنہیں کسی نوجوان کے منہ سے سن کر اس کے دل میں تیر سی جا کر لگتی تھیں۔ ان میں مزہ نہ تھا۔ لفظ نہ تھا۔ نشہ نہ تھا۔ دل نہ تھا بلکہ تصنع تھا۔ فریب تھا اور روکھا پھیکا لفظی تلازمہ، اسے بُرا لگتا تھا۔ صرف عطر و روغن بُرے نہ لگتے تھے۔ سیر تماشے بُرے نہ لگتے۔ بناؤ سنگار کرنا بھی بُرا نہ لگتا تھا البتہ اسے بُرا لگتا تھا صرف طوطارام کے پاس بیٹھنا! وہ اپنا حسن و شباب انہیں نہ دکھانا چاہتی تھی۔ کیوں کہ دیکھنے والی آنکھیں نہ تھیں۔ وہ انہیں ان نعمتوں سے لفظ اندوز ہونے کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ غنچہ نسیم ہی کے مس سے شگفتہ ہوتا ہے۔ دونوں میں یکساں تازگی ہے۔ نرملا کے لیے نسیم سحری کہاں تھی؟

پہلا مہینہ گزرتے ہی طوطارام نے نرملا کو اپنا خزانچی بنالیا۔ کچہری سے آ کر دن بھر کی کمائی اسے دے دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ نرملا ان روپوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائے گی۔ نرملا بڑے شوق سے اس عہدہ کا کام انجام دیتی۔ ایک ایک پیسہ کا حساب لکھتی اگر کبھی

روپے کم ملتے تو پوچھتی کہ آج کم کیوں ہیں؟ امور خانہ داری کے متعلق ان سے خوب باتیں کرتی۔ انہیں باتوں کے لائق وہ انہیں سمجھتی تھی۔ کوئی تفنن آمیز کلمہ ان کی زبان سے نکل جاتا تو اس کا چہرہ اُداس ہو جاتا تھا۔

نرملا جب گہنے کپڑوں سے اپنا سنگار کر کے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوتی اور اس میں اپنے حسن روح افزا کا عکس دیکھتی تو اس کا دل حسرت بھری امنگ سے بے قرار ہو جاتا تھا۔ اس وقت اس کے سینہ میں آگ سی جل اٹھتی تھی۔ جی میں آتا کہ اس گھر کو آگ لگا دوں۔ ماں پر غصہ آتا۔ باپ پر غصہ آتا۔ اپنی قسمت پر غصہ آتا اور سب سے زیادہ غصہ آتا بے چارے بے قصور طوطا رام پر! وہ ہمیشہ اسی کوفت میں مبتلا رہتی۔ بانکا سوار بوڑھے لدّو ٹٹو پر سوار ہونا کب پسند کرے گا؟ خواہ اسے پیدل ہی کیوں نہ چلنا پڑے۔ نرملا کی حالت اسی بانکے سوار کی سی تھی۔ وہ اس پر سوار ہو کر اُڑنا چاہتی تھی۔ اس کی مسرت خیز برق رفتاری کا لطف اٹھانا چاہتی تھی۔ اسے ٹٹو کے ہنہنانے اور کنوتیاں کھڑی کرنے سے کیا امید ہوتی؟ ممکن تھا کہ بچوں کے ساتھ ہنس کھیل کر وہ ذرا دیر کے لیے اپنی حالت کو بھول جاتی۔ دل کچھ ہرا ہو جاتا۔ مگر رکمنی دیوی بچوں کو اس کے پاس پھٹکنے بھی نہ دیتی تھیں۔ گویا وہ کوئی ڈائن ہے، جو انہیں کھا جائے گی۔ رکمنی کا مزاج ساری دنیا سے نرالا تھا۔ یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس بات سے خوش ہوتی تھیں اور کس بات سے ناراض۔ ایک بار جس بات سے خوش ہو جاتی تھیں دوسری بار اسی بات سے ناراض ہوتی تھیں۔ اگر نرملا اپنے کمرہ میں بیٹھی رہتی تو کہتیں کہ نہ جانے کہاں کی منحوس ہے۔ اگر وہ کوٹھے پر جاتی یا مہریوں سے باتیں کرتی تو سینہ کوبی کرنے لگتیں۔ لاج ہے نہ شرم۔ نگوڑی نے حیا بھون کھائی ہے۔ اب کیا؟ کچھ دنوں میں بازار بازار ناچے گی۔ جب سے وکیل صاحب نے نرملا کے ہاتھ میں روپے پیسے دینے شروع کیے، رکمنی اس کی نکتہ چینی پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اب قیامت ہونے میں بہت تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔ لڑکوں کو بار بار پیسہ کی ضرورت پڑتی۔ جب تک خود مالک تھی، انہیں بہلا دیا کرتی تھی۔ اب ان کو سیدھے نرملا کے پاس بھیج دیتی۔ نرملا کو لڑکوں کا چٹورا پن اچھا نہ لگتا تھا۔ کبھی کبھی پیسے دینے سے انکار کر دیتی۔ رکمنی کو اپنے لفظی تیر سر کرنے کا موقع مل جاتا۔ اب تو مالک ہوئی ہیں۔ لڑکے کاہے کو جئیں گے۔ بلا ماں کے بچوں کو کون پوچھے؟ روپیوں کی مٹھائیاں کھا جاتے تھے۔ اب دھیلے دھیلے کو ترستے ہیں۔ نرملا اگر چڑھ کر اگر کسی دن بلا پوچھے پیشہ دے دیتی تو دیوی جی اس کی اور ہی طرح نکتہ چینی کرتیں۔ انہیں کیا لڑکے مریں یا جئیں ان کی بلا سے! ماں کے بغیر کون سمجھائے کہ بیٹا بہت مٹھائی مت کھاؤ۔ آئی گئی تو میرے سر جائے گی۔ انہیں کیا؟.....

(iii)

نرملا نے اب تک اپنی ماں سے اب تک اپنی مصیبت کا حال بیان نہ کیا تھا۔ جو بات ہو گئی اس کا رونا رو کر ماں کو بھی رلانے سے کیا فائدہ؟ پس اس کی ماں سمجھتی تھی کہ نرملا نہایت آرام سے ہے۔ اب جو نرملا کی صورت دیکھی تو اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ لڑکیاں سسرال سے گھل کر نہیں آتیں۔ پھر نرملا جیسی لڑکی، جس کے لیے آسائش کے سبھی سامان موجود تھے۔ اس نے کتنی ہی لڑکیوں کو نیا چاند بن کر سسرال جاتے پورا چاند بن کر واپس آتے دیکھا تھا۔ دل میں سوچ رکھا تھا کہ نرملا کا رنگ نکھر گیا ہو گا۔ جسم بھر کر سڈول ہو گیا ہو گا۔ اور اس کے ہر عضو کا رنگ روپ کچھ اور ہی ہو گیا ہو گا۔ اب جو دیکھا تو اس کا آدھا بدن بھی نہ رہ گیا تھا۔ نہ شباب کی شوخی اور نہ وہ متبسم جلوہ جو دل کو کھینچ لیتا ہے۔ وہ خوبصورتی، وہ نزاکت جو آرام و آسائش کی زندگی کا نتیجہ ہے۔ یہاں نام کو نہ تھی۔ چہرہ زرد، اعضا سست، حالت گری ہوئی۔ نرملا انیس سال ہی کی عمر میں بڈھی ہو گئی تھی۔ جب ماں بیٹیاں رو دھو کر فارغ ہو گئیں تو ماں نے پوچھا، "کیوں ری، کیا وہاں تجھے کھانے کو نہ ملتا

تھا؟اس سے کہیں اچھی تو، تو یہیں تھی۔ وہاں تجھے کیا تکلیف ہوئی؟"

کرشنا نے ہنس کر کہا، "وہاں مالکہ تھیں کہ نہیں! مالکہ کو جو دنیا بھر کے تفکرات رہتے ہیں۔ کھانا کب کھاتیں؟

نرملا: نہیں اماں۔ وہاں کی آب وہوا میرے موافق نہیں۔ طبیعت بھاری رہتی ہے۔

ماں: وکیل صاحب جب شادی میں آئیں گے نہ؟ اس وقت پوچھوں گی کہ آپ نے پھول سی لڑکی لے جا کر اس یہ گت بناڈالی! اچھا اب یہ بتاؤ کہ تو نے یہاں روپے کیوں بھیجے تھے؟ میں نے تو تجھ سے کبھی نہ مانگے تھے۔ لاکھ گئی گزری ہوں مگر بیٹی کا دھن کھانے کی نیت نہیں۔

نرملا نے حیرت سے پوچھا، "کس نے روپے بھیجے تھے اماں؟ میں نے تو نہیں بھیجے۔"

ماں: جھوٹ نہ بول۔ تو نے پانچ سو کے نوٹ نہیں بھیجے تھے؟

کرشنا: بھیجے نہیں تھے تو کیا آسمان سے گر پڑے۔ تمہارا نام صاف لکھا تھا۔ مہر بھی وہیں کی تھی۔

نرملا: تمہارے پیر چھو کر کہتی ہوں کہ میں نے روپے نہیں بھیجے۔ یہ کب کی بات ہے؟

ماں: ارے بھائی۔ دو ڈھائی مہینے ہوئے ہوں گے۔ مگر تو نے نہیں بھیجے، تو آئے کہاں سے؟

نرملا: یہ میں کیا جانوں؟ مگر میں نے روپے نہیں بھیجے۔ ہمارے یہاں تو جب سے جوان بیٹا مرا ہے، کچہری ہی نہیں جاتے۔ میرا ہاتھ تو آپ ہی تنگ تھا۔ روپے کہاں سے آتے؟

ماں: یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ وہاں اور کوئی تیرا قریبی رشتہ دار تو نہیں ہے؟ وکیل صاحب نے تجھ سے چھپا کر تو نہیں بھیجے؟

نرملا: نہیں اماں۔ مجھے تو یقین نہیں۔

ماں: اس کا پتہ لگانا چاہیے۔ میں نے سارے روپے کرشنا کے کہنے پر خرچ کر ڈالے۔ یہی بڑی مشکل ہوئی۔

دونوں لڑکوں میں کسی بات پر جھگڑا شروع ہوا اور کرشنا اس کا نپٹارا کرنے ادھر چلی گئی تو نرملا نے ماں سے کہا۔" اس کے بیاہ کی بات سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا، یہ کیسے ہوا اماں؟"

ماں: یہاں جو سنتا ہے وہی تعجب کرتا ہے۔ جن لوگوں نے طے شدہ شادی سے انکار کر دیا تھا اور وہ بھی محض تھوڑے روپے کے لالچ سے وہ اب بغیر کچھ لیے کیسے بیاہ کرنے پر تیار ہو گئے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتے کہ انہوں نے خود ہی خط بھیجا۔ میں نے صاف لکھ دیا کہ میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ صرف کنیا ہی سے آپ کی خدمت کر سکتی ہوں۔

نرملا: اس کا کچھ جواب نہیں دیا؟

ماں: شاستری جی خط لے کر گئے تھے۔ وہ تو یہ کہتے تھے کہ اب منشی جی کچھ لینے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ اپنی سابق وعدہ خلافی پر کچھ نادم بھی ہیں۔ منشی جی سے تو اتنی فیاضی کی امید نہیں تھی۔ مگر سنتی ہوں کہ ان کے بڑے صاحب زادے نہایت شریف آدمی ہیں۔ انہوں نے کہہ سن کر باپ کو راضی کیا ہے۔

نرملا: پہلے تو وہ حضرت بھی تھیلی چاہتے تھے نہ؟

ماں: ہاں۔ مگر اب تو شاستری جی کہتے تھے کہ جہیز کے نام سے چڑھتے ہیں۔ سنا ہے کہ یہاں بیاہ کرنے پر پچھتاتے بھی تھے۔ روپے کے

لیے بات بگاڑی تھی۔ روپے بھی خوب ملے۔ مگر عورت پسند نہیں۔

نرملا کے دل میں اس شخص کے دیکھنے کی زبردست خواہش ہوئی۔ جو اس سے بے رخی کر کے اب اس کی بہن کا اُودھار کرنا چاہتا ہے۔ یہ کفّارہ سہی مگر کتنے ایسے انسان ہیں جو اس کفارہ کے لیے بھی تیار ہوں؟ ان سے باتیں کرنے کے لیے ملائم الفاظ میں ان کی ملامت کرنے کے لیے اور اپنے حسنِ بے نظیر کی جھلک سے انہیں بھی جلانے کے لیے نرملا کا دل بے چین ہو گیا۔

8.2.3 ناول کا تجزیاتی مطالعہ:

''نرملا'' منشی پریم چند کا ایک مشہور ناول ہے، جو 27 حصوں پر مشتمل ہے۔ اس ناول کے واقعات میں مستقل وقفے کے ساتھ نئے نئے واقعے پیش آتے رہتے ہیں۔ اس کی ابتدا ایک خوش حال لڑکی نرملا کی زندگی سے ہوتی ہے۔ پھر اس کی شادی کا طے ہونا، باپ کا انتقال ہونا اور اس کی شادی کا ٹوٹنا یہ سارے واقعے ایک تسلسل کے ساتھ ہوتے ہیں۔ شادی ٹوٹنے کے بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ اس کی شادی ہوتی ہے۔ اور اب وہ اپنے نئے گھر میں سب کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن اپنے شوہر سے اس کے رشتے معمول کے مطابق نہیں آپاتے ہیں کیوں کہ وہ اس کے والد کی عمر کا ہے۔ تینوں سوتیلے بیٹوں کے ساتھ اچھے مراسم پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس لیے منشی طوطارام کو نرملا اور بڑے بیٹے کے رشتوں پر شک ہوتا ہے۔ منسارام کو جب یہ بات معلوم ہوتی ہے تو وہ بیمار ہوتا ہے، اس کی حالت بگڑتی چلی جاتی ہے اور آخر کار یہ ہونہار بچہ مر جاتا ہے۔ پھر گھر کے حالات کچھ ایسے بگڑتے ہیں کہ باقی دونوں بچے بھی ایک ایک کر کے گھر کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ آخر کار طوطارام اپنے چھوٹے بیٹے کو تلاش کرنے کے لیے گھر بار چھوڑ دیتے ہیں۔ نرملا ان کا انتظار کرتے کرتے ایک دن خود لقمۂ اجل بن جاتی ہے۔ اس طرح اس ناول میں واقعات کا تسلسل چلتا رہتا ہے، ناول میں کہیں کوئی ٹھہراؤ نظر نہیں آتا ہے۔ تمام واقعات مل کر ایک عمدہ پلاٹ کی تشکیل کرتے ہیں اور سارے واقعات ایک دوسرے سے منسلک محسوس ہوتے ہیں۔

نرملا کا موضوع کیا ہے؟ اس پر بہت سی بحثیں ہوتی رہی ہیں اور ناول کے بہت سے ناقدین نے اس ناول کے موضوع کے بارے میں اپنی اپنی آرا پیش کی ہیں۔ ہر کسی نے اپنے اپنے طور پر اس کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان ناقدین کی رائے پر بحث کرنے سے قبل، ناول کے فن کے کچھ تقاضے بھی سمجھ لینے چاہیے۔ ناول بنیادی طور پر تین طرح کے لکھے جاتے ہیں ایک کردار مرکوز ناول، دوم واقعات اور پلاٹ پر مرکوز ناول اور سوم کسی مخصوص موضوع یا حالات پر مرکوز ناول۔ ان تینوں طرح کے ناولوں کے باوجود ناول کا بنیادی موضوع انسانی زندگی ہی ہوتا ہے، ان سب کا بیان اس طرح سے ہونا چاہیے کہ اسے انسانی دائرہ کار میں سمجھا جا سکے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نرملا ناول نرملا کے کردار پر مرکوز ہے اور اس کی زندگی ہی اس ناول کا موضوع ہے۔ یہ ناول نرملا کی تقریباً پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ البتہ اس ناول کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب وہ پندرہ سال کی ہو چکی ہے۔ لیکن اگر غور سے اور وسیع معنی میں دیکھا جائے تو اس کی بیٹی اور چھوٹی بہن کے روپ میں پندرہ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی زندگی بھی اس ناول میں آگئی ہے۔ ویسے یہ ناول صرف نرملا کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سماج میں متوسط طبقے کی تمام عورتوں کی کہانی بیان کرتا ہے۔ ناول میں نرملا کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات آتے ہیں، جب وہ متوسط طبقے سے نچلے طبقے کی عورت بن کر رہ جاتی ہے۔ کم سے کم دو وقت ایسے ضرور آتے ہیں جب وہ متوسط طبقے سے نچلے طبقے کی زندگی جینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

پہلے اس وقت جب کہ اس کے والد بابو اودے بھان لال کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اور اس کے شادی اسی غربت کی وجہ سے ہی منشی

طوطارام وکیل کے ساتھ ہوتی ہے، جو پہلے سے تین بچوں کا باپ ہے اور اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ نرملا کی زندگی میں غریبی کا دوسرا موقع اس وقت آتا ہے جب اس کے شوہر اسے چھوڑ کر اپنے تیسرے بیٹے کو ڈھونڈنے نکل جاتے ہیں اور کئی مہینوں تک واپس نہیں آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی غربت کا دور اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب نرملا کا بڑا لڑکا منسارام مر جاتا ہے اور منشی طوطارام کا وکالت کے پیشے میں جی نہیں لگتا ہے۔ منسارام کے مرنے کے بعد ہی وکیل صاحب کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو پاتا ہے۔ نرملا کی زندگی کے ساتھ اس کی جدوجہد بہت طویل بھی ہے اور مشکل بھی۔ جو سچ پوچھو تو شادی کے بعد اسے سکھ بھری زندگی کبھی نہیں مل پاتی ہے۔ پہلے رشتوں کی کشمکش خاص طور سے اپنے شوہر سے اس کے رشتے معمول کے مطابق کبھی بھی نہیں ہو پاتے ہیں۔ وہ طوطارام کو دل سے اپنے پتی کے روپ میں قبول ہی نہیں کر پاتی ہے کیونکہ وہ اس کے والد کی عمر کے ہیں۔ اگرچہ وہ اس گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے بیٹوں کے ساتھ خاص طور سے اس کے بڑے بیٹے کے ساتھ رشتے بڑے کشمکش بھرے ہیں، دونوں میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہوتی ہے کہ جس سے سوتیلی ماں اور بیٹے کا رشتہ داغ دار ہو، لیکن نرملا جب اپنی چھوٹی بہن کرشنا کی شادی میں جاتی ہے تو وہ اس سے اس بات کا اظہار بھی کرتی ہے کہ اس کی شخصیت بڑی پرکشش تھی اور لگتا تھا کہ دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہوں اور اس سے ٹیوشن پڑھنے کا سبب بھی یہی کشش تھی۔ منشی طوطارام ان ماں بیٹوں کے رشتے پر شک کرتے ہیں، جب کہ منسارام کے وہم گمان میں بھی نرملا کے لیے ماں کے سوا کوئی رشتہ نہ تھا اور نہ وہ کسی طرح کی ایسی بات کا اظہار کرتا ہے، جس سے ظاہر ہو کہ اس نے رشتے کے تقدس کو کبھی خیال میں بھی داغ دار کیا ہو۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس الزام کو لے کر جی نہیں پاتا ہے، اور جلد ہی بیماری اور صدمے سے مر جاتا ہے۔

اس ناول کا ایک اہم موضوع جہیز بھی ہے۔ ہماری زندگی خاص طور سے لڑکیوں کی شادی کب اور کہاں سے ہو گی یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ان کے والدین اسے جہیز کتنا اور کب دے سکتے ہیں۔ اور لڑکیوں کی باقی زندگی ان کی شادی پر منحصر ہوتی ہے۔ اگرچہ پریم چند کے زمانے سے ہمارے زمانے تک سماج میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں لیکن جہیز ایسی برائی ہے جس کے بارے میں یقین کے ساتھ ابھی بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب یہ برائی ختم ہو رہی ہے یا بہت کم ہو گئی ہے۔ بلکہ بعض علاقوں یا خاندانوں میں یہ برائی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر شمیم نکہت نے نرملا ناول کے بارے میں جو لکھا ہے وہ بہت اہم ہے، وہ لکھتی ہیں۔

> ”جہیز کا مسئلہ بھی پریم چند کے یہاں مختلف سماجی برائیوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ جس کے خلاف انھوں نے بھرپور آواز اٹھائی تھی، ان کے بہت سے کردار خود وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ بہت سے مصلح پیدا بھی ہوئے لیکن یہ مسئلہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔“

نرملا ناول میں جہیز اہم موضوع بن کر ابھرا ہے، اگرچہ پورے ناول میں جہیز کا موضوع زیر بحث نہیں ہے۔ ابتدا میں ہے پھر دوسری بار جب اس کی بہن کی شادی بغیر جہیز کے طے پاتی ہے، تب جہیز کا ذکر ہے لیکن اس بار جہیز نہ لیا جانا موضوع بنتا ہے۔ سماجی برائی کو دل بدلنے سے دور کرنے کا طریقہ پریم چند کا آزمودہ فارمولہ ہے، نرملا ناول میں بھی پریم چند وہی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس ناول میں نرملا کی پوری زندگی جہیز نہ دے پانے کے وجہ سے بدل جاتی ہے۔ اور بعد میں جو پوری زندگی وہ گزارتی ہے وہ جہیز کی وجہ سے ہی ہے، نہیں تو اس کی زندگی شاید اس سے مختلف ہوتی۔ نرملا کا موضوع پریم چند کے دیگر بیشتر ناولوں سے اس لیے الگ ہے کہ اس ناول میں پریم چند نے بندھے بندھائے اور اجتماعی زندگی کے موضوعات کو نہیں برتا ہے بلکہ بہت حد تک طوطارام اور نرملا کی ذاتی زندگی کو موضوع بنایا ہے

پریم چند کے اکثر ناولوں میں کسانوں کی بغاوت، سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسئلوں پر براہ راست خطاب کیا جاتا رہا ہے اور ان مسئلوں پر ان کی گہری نظر بھی تھی۔ لیکن اس ناول میں یہ مسئلے نہیں اٹھائے گئے ہیں۔ بلکہ کچھ دوسرے مسائل خاص طور سے گھریلو اور نفسیاتی مسائل کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بات اس ناول کی کوئی خامی نہیں ہے بلکہ ایک خوبی ہے کہ وہ اپنے بنے بنائے فارمولوں سے آگے بھی بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کوئی مسئلہ یا موضوع کتنا بھی اہم کیوں نہ ہو، لیکن جب ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائے گا تو اس سے فن ناول نگاری کہیں نہ کہیں مجروح ہوتی ہے۔ ایک بڑا مصنف اسی طرح اپنی ہی بنائی دیوار کو گراتا بھی چلتا ہے۔

اس ناول کے مرکز میں نرملا کی زندگی ہے اور وہی اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس ناول میں نرملا کی داخلی کیفیات اور خارجی روداد سب بہت فطری بہاؤ کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ وہ ایک ایسا جیتا جاگتا کردار ہے کہ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نظر آتی ہے اور آخر میں اپنی موت کے ساتھ ہر قاری کی ہمدردی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اس ناول میں نرملا کے علاوہ بھی کئی اہم کردار ہیں۔ نرملا کے پہلے گھر میں اس کی چھوٹی بہن کرشنا، اس کے ماں باپ اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ شادی کے بعد دوسرے گھر میں شوہر اور اس کے تین سوتیلے بیٹے ہیں۔ ساتھ ہی نرملا کی نند رکمنی اور ایک خدمات گار بھنگی بھی اہم کردار ہیں۔ نرملا کے دونوں گھروں کے علاوہ اس ناول میں ایک تیسرا گھر بھی اہم ہے، وہ ہیں ڈاکٹر اور اس کی بیوی سدھا۔ سبھی کردار وقت پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور ناول کو آگے بڑھاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے مرکز میں نرملا کا کردار ہی ہے۔ سبھی کرداروں کی کردار نگاری پر حسب ضرورت توجہ دی گئی ہے۔ لیکن تقریباً ہر واقعے اور ہر کردار کے مرکز میں نرملا ہی ہے۔ اس لیے یہ کردار ان کرداروں میں سے ہے جو ناول میں ایک مرکزی کردار کے ارد گرد بنے جاتے ہیں۔ نرملا نہ صرف اس ناول کی مرکزی کردار ہے بلکہ ناول کا مرکزی موضوع بھی ہے۔ البتہ نرملا کی کردار نگاری میں ایک خامی یہ ہے کہ ڈاکٹر کا جب شروع میں بھون موہن کے طور پر تعارف ہوتا ہے وہ کالج میں پڑھنے والا جہیز کا لالچی نوجوان ہے، پھر وہ اتنا نیک انسان اور ڈاکٹر کیسے بن جاتا ہے؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

نرملا ایک ایسا ناول ہے جس میں تکنیک کا استعمال بہت سادگی سے کیا گیا ہے، خارجی سطح پر کہیں کوئی تکنیک نظر نہیں آتی ہے لیکن داخلی طور پر تکنیک اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ کلاسیکی ناول کی تعریف کی طرح اس ناول کا ایک آغاز ہوتا ہے، پھر ایک سیٹ اپ کے تحت کچھ واقعے وقوع پذیر ہوتے ہیں، جو بعد کے حالات کو متعین کرتے ہیں اور ناول کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ خاص طور سے نرملا کے والد بابو اودے بھان کی موت کا واقعہ اس ناول میں سیٹ اپ کا کام کرتا ہے اور اس کے بعد کا پورا ناول کہیں نہ کہیں اس موت سے متاثر رہتا ہے لیکن یہ کام بھی بہت فطری طور پر ہوا ہے، کسی فارمولا کے تحت نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد گھر کے مالی حالات کے تحت نرملا کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے ہو جاتی ہے اور وہ کئی رشتوں کی کشمکش اور تصادم سے گزرتی ہے۔ اس کے تین بیٹے ایک ایک کر کے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ بڑے لڑکے کی موت ہو جاتی ہے باقی دونوں لڑکے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ پھر طوطا رام سیارام کو ڈھونڈنے نکلتے ہیں اور کلائمکس آتا ہے۔ آخر میں نرملا کی موت کے ساتھ ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔

تقریباً پورا ناول ایک سیدھے اور فطری ارتقا کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کوئی فلیش بیک نہیں ہے، کوئی فلیش فارورڈ نہیں ہے، کوئی جدید تکنیک مثلاً جادوئی حقیقت نگاری، شعور کی رو یا کوئی فوق فطری عناصر بھی اس ناول میں نہیں ہے۔ یہ تمام تکنیکیں ناول کو موثر بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں لیکن جب ان کا بہتر استعمال کیا جائے، نہیں تو ناول بہتر ہونے کی بجائے خراب بھی ہو سکتا ہے۔

پریم چند نے نرملا میں ان میں سے کسی بھی تکنیک کا استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ حقیقت کا ہاتھ تھامے کلاسیکی انداز میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی قاری ایک بار یہ ناول پڑھنا شروع کر دے تو پڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ پڑھنے والا کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے، چاہے ناول کا مشاق اور تربیت یافتہ قاری یعنی نقاد ہو یا بالکل عام قاری ہو جسے ناول کی الف بے بھی نہیں معلوم ہو، وہ بھی اس ناول کو پڑھنا شروع کرے تو ناول میں لطف آنے لگے گا۔ اس ناول کے لیے یہ شرط لاگو نہیں ہوتی ہے کہ ناول کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کی ناول پڑھنے کی تربیت ہونی چاہیے۔ یہ ایسا ناول ہے کہ جسے کوئی بھی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے، بس اسے بنیادی زبان آنی چاہیے۔ ویسے تو یہ خوبی پریم چند کے تقریباً سبھی ناولوں میں پائی جاتی ہے لیکن نرملا میں زیادہ بہتر طریقے سے آئی ہے۔ دراصل اوپر جن تکنیکوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کا وجود ہی نرملا لکھے جانے کے بعد آیا۔ اس لیے پریم چند سے ان تکنیکوں کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

پریم چند کا فن بنیادی طور پر حقیقت نگاری کا فن ہے، یہی ان کے فن کی بنیادی شناخت ہے۔ اس کے علاوہ پریم چند کے فن کی ایک اور شناخت ان کی فکری وابستگی ہے۔ وہ ہر حال میں کسان، مزدور اور دیگر غریب لوگوں کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ لیکن نرملا ان کے اکثر ناولوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ اس میں نہ کسان ہیں نہ مزدور اور نہ غریب۔ نرملا ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے لیکن زندگی کی کشمکش اور جدوجہد نرملا کی زندگی میں بھی ہے۔ یہ کشمکش اور جدوجہد اس ناول کی بڑی خوبی ہے۔ ناول میں بے میل شادی کی خامیوں کو بڑی شدت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ بے میل شادیاں اگرچہ اب کافی کم ہوئی ہیں لیکن اس وقت کے سماج میں بہت زیادہ تھیں اور اکثر خاندان میں ایسی شادیاں دکھائی دیتی تھیں، یہ مسئلہ اُس وقت کے سماج کی بڑی حقیقت تھی۔ اس ناول میں کہیں کہیں تھوڑی شدت پسندی سے کام لیا گیا ہے، جو ناول کو کہیں کہیں غیر فطری بھی بناتا ہے۔ مثلاً ناول کے شروع میں نرملا کی ماں اور باپ کی لڑائی بہت غیر فطری نظر آتی ہے، شوہر بیوی کے رشتے میں کشمکش تو ہمیشہ سے رہی ہے لیکن جس طرح نرملا کی ماں اور باپ میں ایک غیر متعلق موضوع پر بحث ہوتی ہے اور بحث کو اتنا طول دے دینا کہیں نہ کہیں غیر فطری لگتا ہے۔ یا جب منسارام شدید بیمار ہے اور اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اس وقت بھی نرملا اور منسارام کے رشتے کو شک کی نظروں سے دیکھنا اور اسے گھر لانے پر تیار نہ ہونا، یا نرملا کے ہسپتال جانے پر طوطارام کا اتنا ناراض ہونا ایک غیر فطری واقعہ محسوس ہوتا ہے۔ دراصل منسارام کی موت کو دکھانا تھا، اس لیے غیر فطری طور پر اس شک کو اتنا بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہے۔

مجموعی طور پر نرملا ناول ایک اچھا فن پارہ ہے جس میں ناول کی فنی خوبیاں کافی بہتر طریقے سے پیش کی گئی ہیں۔ اس ناول کو ناول کے فن اور اس کی روایت کے تناظر میں ہی دیکھنا ہوگا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس ناول کو بھی انھیں فنی عناصر سے پرکھا جائے جو خوبیاں ان کے دوسرے ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ ناول ایک مختلف ناول ہے جس میں انسانی زندگی کو بہت خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور سے ایک عورت کی گھریلو، سماجی اور معاشی زندگی کو بہت حقیقت پسندی اور بے باکی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس ناول میں دیہی زندگی کی عکاسی نہیں کی گئی ہے بلکہ شہری زندگی کے متوسط گھرانوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بیشتر ناولوں کی طرح نرملا میں کوئی سیاسی فکر و عمل نظر نہیں آتا ہے، اس زمانے کی تحریکیں نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن لوگ کیسے رہتے تھے؟ خصوصاً عورتیں کن حالات سے گزر رہی تھیں؟ اس ناول میں فنی، تکنیکی اور نفسیاتی عناصر کو بہتر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

ناول نرملا کی فنی باریکیاں یہ بھی ہیں کہ اس ناول میں ہیئت اور ساخت کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک اچھے ناول سے توقع کی

جاتی ہیں لیکن اس میں کوئی نیا تجربہ بھی نہیں ہے۔ یہ ناول کلاسیکی انداز کے مطابق بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں بار بار نئے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، یہ سب سلسلے وار اور ایک مخصوص ترتیب سے ہوتا ہے۔ سب مل کر ایک اچھے پلاٹ کی تعمیر کرتے ہیں، کردار نگاری کے معاملے میں یہ ناول یقیناً ایک بہت اہم ناول ہے اور نرملا کا کردار اپنی زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ نفسیاتی، ذہنی، اور معاشی مسائل سے گزرتی ہے اور آخر کار اپنے المیہ انجام کو پہنچتی ہے۔ نرملا کا کردار ایک یادگار کردار ہے، اس کردار میں مثالیت پسندی نہیں ہے اور حقیقت کی زمین سے ابھرا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے بھی یہ ناول ایک سیدھا سادہ اور کلاسیکی روایت کے مطابق ہے۔ ناول فطری بہاؤ میں وقت کے ساتھ بہتا ہے، کچھ یادوں کو بطور تکنیک بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

8.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ''نرملا'' منشی پریم چند کا ایک مشہور ناول ہے، جو 27 حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول ہندی ماہنامہ چاند میں نومبر 1925 سے لے کر نومبر 1926 تک مسلسل قسط وار شائع ہوا، جو بہت مقبول ہوا۔
- اس ناول کو پہلی مرتبہ جنوری 1927 میں چاند پریس نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کے بعد پریم چند نے خود اس کا ترجمہ اردو میں کیا اور گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے 1929 میں شائع کرایا۔
- ''نرملا'' پریم چند کا تیسرا ایسا ناول ہے جو ایک عورت پر مرکوز تھا۔ اس سے قبل پریم چند کے دو ناول ''بیوہ'' اور ''بازارِ حسن'' خواتین پر مرکوز شائع ہو چکے تھے۔
- نرملا ایک عام عورت ہے جو زندگی سے بھر پور ہے، جس میں انسانی خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہیں، وہ نہ کوئی مثالی کردار ہے اور نہ بگڑی ہوئی عورت ہے۔
- اس ناول میں عام گھریلو زندگی کے بہانے انسانی زندگی اور سماج کی کئی برائیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور سب کچھ ناول کے فنی دائرہ کار میں رہ کر کیا گیا ہے۔
- محض عورتوں کے مسائل کو پیش کرنے کے لیے ناول کا سہارا نہیں لیا گیا ہے، اس میں زندگی کو فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول موضوعاتی اور فنی اعتبار سے عورتوں پر مرکوز پریم چند کے دیگر ناولوں سے بہتر ہے۔
- ناول ''نرملا'' نرملا کے کردار پر مرکوز ہے اور اس کی زندگی ہی اس ناول کا موضوع ہے، جو نرملا کی تقریباً پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔
- اس ناول کا ایک اہم موضوع جہیز بھی ہے۔ نرملا ناول میں جہیز اہم موضوع بن کر ابھرا ہے۔ اگرچہ ناول کی ابتدا ہی میں جہیز کا موضوع زیر بحث آیا ہے۔

- نرملا ایک ایسا ناول ہے جس میں تکنیک کا استعمال بہت سادگی سے کیا گیا ہے، خارجی سطح پر کہیں کوئی تکنیک نظر نہیں آتی ہے لیکن داخلی طور پر تکنیک اپنا کام کرتی رہتی ہے۔
- پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح نرملا کی بھی زبان عام طور پر آسان اور سادہ ہے۔جو تھوڑی سی کوشش پر اردو سے ہندی بن جاتی ہے اور اس کے بر عکس ہندی سے اردو بھی بن جاتی ہے۔

8.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
دل جوئی کرنا	:	کسی کے دل کو خوش کرنا
تعلیم و تربیت اور آسائش	:	بچے کی اچھی تعلیم اور پرورش کے ساتھ ساتھ آرام کا خیال کرنا
نا اہل کے گلے باندھنا	:	جو مستحق نہ ہو اس کے ساتھ شادی کرنا
آزمودہ فارمولہ	:	ایسے اصول جو پہلے سے آزمائے جا چکے ہوں
داہ سنسکار	:	ہندو مذہب کے مطابق کسی کے انتقال کی آخری رسوم
مثالی کردار	:	وہ کردار جن میں انسانی کمزوریاں نہ ہوں
بیانیہ	:	کسی فکشن افسانہ اور ناول کا وہ حصہ جسے راوی اپنی زبان میں بیان کرے
فلیش بیک	:	ماضی میں ہوئے قصے کو بیان کرنا
فلیش فارورڈ	:	مستقبل میں ممکن واقعے کا تصور کرنا
شعور کی رو	:	ایک ذہنی کیفیت جس میں وقت کے آر پار جا کر سوچا جاتا ہے
جادوئی حقیقت نگاری	:	بظاہر جادوئی بات لیکن اس میں حقیقت کا جواز بھی ہو
کشمکش	:	الجھن،کشاکش

8.5 نمونۂ امتحانی سوالات

8.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ناول ''نرملا'' پہلی بار کس رسالے میں قسط وار شائع ہوا؟

(a) چاند (b) زمانہ (c) نگار (d) ہنس

2۔ ناول ''نرملا'' پہلی بار کس زبان میں شائع ہوا؟

(a) اردو (b)انگریزی (c)ہندی (d)فارسی

3۔ ناول ''نرملا'' کا اردو ترجمہ کس نے کیا؟

(a) اکبر حیدری (b) قمر رئیس (c) شمیم نکہت (d) پریم چند

4۔ ناول ''نرملا'' اردو میں کب شائع ہوا؟

(a) 1925 (b) 1929 (c) 1932 (d) 1936

5۔ ناول ''نرملا'' کا مرکزی کردار کون ہے؟

(a) نرملا (b) کرشنا (c) سدھا (d) موہن

6۔ نرملا کی چھوٹی بہن کا نام کیا تھا؟

(a) سدھا (b) رکمنی (c) کرشنا (d) بھنگی

7۔ ناول ''نرملا'' کتنے حصوں پر مشتمل ہے؟

(a) 27 (b) 25 (c) 21 (d) 17

8۔ نرملا کے باپ کا نام کیا ہے؟

(a) بھون موہن سنہا (b) بابو بھال چند سنہا (c) بابو اُودے بھان لال (d) ان میں سے کوئی نہیں

9۔ نرملا کے شوہر طوطا رام کا پیشہ کیا تھا؟

(a) ڈاکٹر (b) تجارت (c) مزدوری (d) وکیل

10۔ ناول ''نرملا'' کا مصنف کون ہے؟

(a) پریم چند (b) کرشن چندر (c) عبدالحلیم شرر (d) قرۃالعین حیدر

8.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ناول ''نرملا'' کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ ناول ''نرملا'' کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3۔ ناول ''نرملا'' کے موضوع پر نوٹ لکھیے۔

4۔ 'نرملا' کے کردار کی خوبیاں بیان کیجیے۔

5۔ ناول ''نرملا'' کے حوالے سے پریم چند کی زبان پر گفتگو کیجیے۔

8.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ناول کے حوالے سے نرملا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

2۔ اکائی میں شامل منتخب متن کی تشریح کیجیے۔

3۔ ناول ''نرملا'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیجیے۔

8.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1۔	نرملا(ناول)	پریم چند
2۔	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحیثیت ناول نگار	پروفیسر قمر رئیس
3۔	پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار	ڈاکٹر شمیم نکہت
4۔	پریم چند شناسی	پروفیسر آفاق احمد (مرتبہ)
5۔	فکشن کے فن کار: پریم چند	پروفیسر شکیل الرحمن

8.5.1 کے جوابات:

A۔1	C۔2	D۔3	B۔4	A۔5
C۔6	A۔7	C۔8	D۔9	A۔10

نمونہ امتحانی پرچہ

Maulana Azad National Urdu University

B.A. I Semester Examination

(Premchand)

Paper Code: BNUR201DET

Time: 2hrs. Marks: 35

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً دی گئی ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

حصہ اول میں 5 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ **(1x5=5 Marks)**

حصہ دوم میں مختصر سوالات پر مبنی ہے، اور اس میں طالب علم کو کوئی چار سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً **100 لفظوں پر مشتمل ہے**۔ ہر سوال کے لیے 5 نمبرز مختص ہیں۔ **(4x5=20 Marks)**

حصہ سوم میں دو سوالات ہیں، اس میں سے طالب علم کو کوئی ایک سوال کا جواب دینا ہے۔ ہر سوال کا جواب تقریباً **(250) لفظوں پر مشتمل ہے** ۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرز مختص ہیں۔ **(1x10=10 Marks)**

حصہ اول

سوال 1:

(i) ذیل کا کون سا ناول عورتوں کے مسائل پر لکھا گیا ہے؟

(a) گئودان (b) بازارِ حسن (c) اسرار معابد (d) چوگان ہستی

(ii) پریم چند نے کس نام سے پریس قائم کیا؟

(a) مریادا (b) سمّان (c) سرسوتی (d) نول کشور

(iii) پریم چند کا آخری ناول کون سا ہے؟

(a) منگل سوتر (b) چوگان ہستی (c) نرملا (d) بیوہ

(iv) پریم چند کی تحریروں کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

(a) تفریح (b) اصلاحِ معاشرہ (c) سیاسی پروپیگنڈہ (d) مذہبی تعلیم

(v) "کرم بھومی" کس ناول کا ہندی ترجمہ ہے؟

(a)میدان عمل (b)نرملا (c)منگل سوتر (d)بازار حسن

حصہ دوم

2۔ 'ہنس' کے علاوہ پریم چند نے کن کن رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیے؟

3۔ پریم چند کے تراجم پر نوٹ لکھیے۔

4۔ پریم چند کے افسانوں میں خواتین کے کردار کا تجزیہ کیجیے۔

5۔ پریم چند کے ناولوں میں زماں و مکاں کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

6۔ ناول "نرملا" کے حوالے سے پریم چند کی زبان پر گفتگو کیجیے۔

7۔ پریم چند کے عہد کے سیاسی حالات پر نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

8۔ پریم چند کے ادبی معاصرین میں سے کسی دو کے بارے میں تفصیل سے مضمون لکھیے۔

9۔ افسانہ "عید گاہ" کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔